افسانے

فریدہ زرین

فریدہ زین

سنہ اشاعت	١٩٩١ء
تعداد	ایک ہزار
کتابت	محمد عارف الدین
مطبوعہ	ڈائمنڈ آفسٹ پریس۔
قیمت	اٹھارہ روپے (١٨)
تزئین کار	ایم ، ایم سعید ایس ایچ صدیقی

ملنے کا پتہ

فون نمبر ٢٢٣٧٠٦

فریدہ زین پرنسپل ، فلاور زون ، ہائی اسکول

مصنّفہ۔ "فروزاں" ١١-٥-٤٩/A ریڈ ہلز ، حیدرآباد ٥٠٠٠٠٤

انتساب

کاروانِ حیات کے نام

جو

سفر سے منزل تک ، جذب سے کرب تک ،

نقطے سے حرف تک ، احساس سے تپش تک ،

روشن صبح سے مایوس شام تک کی تمام راہوں پر

گامزن ہے

خدیجہ زرینؔ

ترتیب

میں اور میرا قلم

میں ـــــ میں تو ایک پیکر خاکی ہوں مگر لفظوں کا پیرہن دے کر مجھے فریدہ زین کے رُوپ میں آپ کے رُوبرو لانے والا میرا قلم ہی تو ہے اس لئے تعارف میرا نہیں میرے قلم کا ہونا چاہیئے۔

قلم کی اہمیت اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب کاتبِ تقدیر نے اسے بنایا اور اولادِ آدم کی تقدیر لکھی۔

اس قلم نے بھی کیا کیا کرشمے دکھائے ـــــ کبھی لفظوں کے گل بوٹے سجائے تو کبھی کانٹوں کی چبھن کا احساس دلایا۔ کبھی دلوں کو گرمایا تو کبھی رُوح کو تڑپایا۔ کبھی لبوں پر تبسم دیا تو کبھی چشم کو نم کیا۔

شاعروں اور ادیبوں کے پاس ان کی انگلیاں خامہ بن گئیں اور نوکِ مژگان قلم۔ فیض نے یہاں تک کہہ دیا ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔ "اسلاف میرے تیر چلاتے

تھے ۔ اب ان کا تیر ٹوٹ کر میرا قلم بن گیا ہے۔"

مگر ـــــ میرے حصے میں کسی کا کوئی ٹوٹا ہوا تیر نہ آیا ۔ میں نے خود ہی قلم اٹھا لیا ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں صرف آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی میرے قلم سے ہلکی پھلکی کہانیاں جنم لینے لگیں۔

پھر عمر اور ذہن کے ساتھ ساتھ میری نظر گہری ، میرا دل حساس اور میری انگلیاں متحرک ہوگئیں ـــــ والد کی اچانک موت نے شعورِ غم سکھا دیا میرا قلم سوگ میں ڈوب گیا ۔ میری انگلیاں ساکت ہوگئیں ۔ کاغذ کے صفحات پر ملگجی شاموں کی اداسی برفیلی راتوں کی خاموشی اور ویران صحراؤں کا سناٹا پھیل گیا ۔

سکوت کے ان لمحوں میں زین صاحب کی مسیحائی نے میرے قلم کو پھر ایک بار متحرک کر دیا اور میں اپنے رِستے ہوئے زخموں کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے لگی ١٩٧٠ء سے میرے قلم کو شناسائی مل گئی ۔ پہلا افسانوی مجموعہ "سسکتی چاندنی" بن کر آیا اور دوسرا "دِل سے دار تک" ۔ اب میں اپنے ساتھ لائی ہوں " اے گردشِ دوراں " ۔

سکّے کے دو رُخ کی طرح زندگی کے بھی دو پہلو ہیں ۔ خوشی اور غم . . احساس کے بغیر زندگی ادھوری ہے میں نے سسکتے لمحے زیادہ دیکھے ۔ شاید اسی لئے میرے سارے احساسات میرے قلم نے سمیٹ لئے ۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات ، اخباروں کی سرخیاں ، ارد گرد گھومتا کوئی کردار میرے تخلیق کا محرک رہا لاکھ کوشش کے باوجود میں اپنے قارئین کو مسکراہٹ کے پھول نہ پیش کر سکی اس کی وجہ میرا وہ احساسِ غم ہے جو ذہن کے گوشے میں چھپا بیٹھا ہے ۔

غم ـــــ میرا اپنا نہیں زمانے بھر کا غم ہے ـــــ . . . . . .

بہر حال اس جہانِ رنگ و بو میں سوز و ساز ، درد و داغ ، جستجو و آرزو کے

چہرے دیکھے اور میرا قلم ان کے نقوش بنانے لگا۔

آپ سے رخصت ہوتے ہوئے میں اس قلم سے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتی چلوں جنھوں نے "اے گردشِ دوراں" کی تکمیل کے لئے خلوصِ دل سے کام لیا۔ اس خصوص میں جناب محمد عارف الدین صاحب خوشنویس کی میں بے حد ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف کتابت کی ذمہ داری سنبھالی بلکہ مخلصانہ مشوروں اور مساعی سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے سرگرم عمل رہے۔ میں مشکور ہوں آرٹسٹ جناب قیصر سرمست صاحب کی جنھوں نے "اے گردشِ دوراں" کو رنگوں کی سچائی میں ڈبو دیا۔ جناب مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب کا بھی میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے طباعت کی ذمہ داری قبول کی۔

آخر میں میں اپنے بھائی محبوب حسین سعید اور اپنے بھانجے سلیم الحق صدیقی کی کوششوں اور کاوشوں کی احسان مند ہوں جنھوں نے اس مجموعے کے آغاز سے اختتام تک کی تمام ذمہ داری سنبھالی۔

میرے اوراق ادھورے رہ جائیں گے، اگر میں زین صاحب کا نام نہ لوں جن کی کرم فرمائیوں نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔

فریدہ زین

اے گردشِ دوراں......

"گلابی ٹیبل صاف کر دے"

"گلابی پانی لے آ"!

"گلابی لانڈری سے کپڑے لا دے"

"گلابی جوتا پالش کر دے"

یہ سارے جملے سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے۔ غربت اور مفلسی کی دھرتی پر اُگا ہوا یہ گلاب نواب صاحب کے شاندار بنگلے میں بحیثیت ملازمہ متعارف ہوا۔ صبح کے چھ بجے سے رات کے دس بجے تک اس کے کانوں میں صرف یہی آوازیں گونجتیں۔ سات برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے مگر اس عمر میں اسے ڈھیروں کام کرنے پڑتے وہ جنگل کی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی سارا کام اچھل کود کر کر لیتی۔ گھر کے سارے افراد اس سے خوش تھے، پل بھر کو وہ دکھائی نہ دیتی تو جیسے سناٹا چھا جاتا۔

سارے دن کے کام کاج کے بعد جب وہ رات کو گھر لوٹتی تو اس کا انگ انگ ٹوٹتا محسوس ہوتا۔

"اماں میرے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے۔"

"یہاں تو زندگی میں ہی درد بھرا پڑا ہے۔" اس کی ماں ماضی کے اوراق

اٹھنے لگتی۔ کس طرح حامد نے اسے چھوڑ دیا۔ گلابی کی پیدائش کے دوسرے سال ہی وہ یوں غائب ہوا کہ پھر آج تک کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کی ماں گلابی کو اپنے نصیب کا دشمن سمجھنے لگی تھی۔ اس کی معصومیت ماں کی تیز نظروں سے جھلنے لگی۔ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر تھی بس اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ بہت دور چلا گیا ہے اور اس کی ماں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتی۔ نواب صاحب کے بنگلے کے ایک کونے میں اسے بٹھا کر وہ سارا کام تھکے ہارے ہاتھوں اور ڈوبتی سانسوں سے کرتی رہتی۔ کام کے دوران اسے شدت کی کھانسی ہوتی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو کر باہر نکل جاتیں اور کوئی دوسرا ملازم اسے پانی دے کر کسی دیوار کے سہارے بٹھا دیتا۔ اس کی یہ حالت زیادہ دن تک چھپی نہ رہی۔ بڑے سرکار نے اسے گھر بٹھا دیا۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بیماری ان کے گھر کا راستہ نہ دیکھ لے۔

چار چھ دن کے فاقوں نے جب حالت ابتر کر دی تو اس کی ماں نے سات سالہ گلابی کو بیگم صاحبہ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بیگم صاحبہ گلابی آج سے آپ کی خدمت گار رہے گی۔ اسے میری جگہ رکھ لیں۔ یہ سب کام کر لے گی۔ کم سے کم اسے تو دو وقت کی روٹی مل جائیگی میں کچھ علاج کرا لوں تو واپس کام پر چلی آؤں گی۔" وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے سوچا واقعی ان کے بچوں کے لئے ایک ایسی ہی ملازمہ چاہیئے۔ جو ان کا ہر کام کر سکے۔ گلابی ماں کا پلو تھامے اپنی گردن کو انکار کے انداز میں ہلا رہی تھی۔ وہ تو اسکول جانے کے سپنے دیکھ رہی تھی یونیفارم پہنے کتابوں کا بیگ سنبھالے۔ ویسے صبح فجر کی نماز کے بعد اپنے محلے کی

مسجد میں عربی پڑھنے تو وہ جاتی تھی، دبے دبے لفظوں میں جب اس نے "نا" کہنے کی کوشش کی تو ماں نے اس کے بازو میں چٹکی بھر دی، وہ تلملا کر چپ ہو گئی۔ اور پھر گلابی کی رنگت سنولانے لگی۔

بڑے بابو کے جوتوں کو پالش کرنا، ننّھی بے بی کے کپڑوں کو استری کروانا۔ جمی بابا کے کھلونے دن میں دس بار سلیقے سے جمانا۔ ان لوگوں کے بیدار ہونے سے لے کر آرام کرنے تک کے سارے کام اس کے ذمے ہوتے اور وہ پوری دلجوئی سے یہ کام کرتی۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا کہ کبھی کبھی وہ ننھی بے بی کے عمدہ فراکوں کو للچائی نظروں سے دیکھ لیتی۔ جمی بابا کے کھلونوں سے کھیل لیتی اور کبھی ان کی بچائی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں سمیٹ کر اماں کے لئے لے آتی۔ وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن تھی۔ مگر ایک کھٹک اسے ضرور ہوتی کہ وہ اور ننّھی بے بی ایک ہی عمر کی ہیں تو پھر وہ مخمل پر کیوں چلتی ہیں اور اسے پتھریلی زمین پر کیوں دوڑنا پڑتا ہے۔ وہ اُبلے ہوئے انڈے ٹوسٹ، مکھن اور بالائی کھاتی ہیں، اس کے حصہ میں باسی کھانا کیوں ہے ــــــ؟ معصوم ذہن ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔

اس کا بچپن زندگی کے تلخ راستوں اور حالات کے سنگین چٹانوں سے ٹکرا کر بکھرنے لگا تھا۔ ناشتے کے ٹیبل پر ٹوسٹ، مکھن، اور میووں کو دیکھ کر اس کا بھی جی چاہتا۔ کاش وہ بھی ننّھی بے بی، جمی بابا کی طرح ہوتی اس کی ماں بھی اسے ہر روز ایسے ہی سجے سجائے انداز میں ناشتہ کرواتی مگر ــــــ مگر اس کی توجہ ماں کی کھانسی کی طرف چلی جاتی۔ ڈاکٹر نے خود اس کے لئے اچھی غذا اور میوے کھلانے کی تاکید کی ہے جب کہ وہ اپنے حصے کے کھانے ہی سے ماں کا آدھا پیٹ بھر سکتی تھی۔ دوائیں اور میوے تو پہونچ سے دور تھے۔ سرکاری اسپتال میں گھنٹوں قطار میں کھڑے رہنے کے بعد جو دوا ملتی اس میں زیادہ ذائقہ پانی ہی

کا ہوتا۔ انجکشن تو دواخانے کے اسٹاک ہی میں نہ تھا۔ جب تک بازار سے خرید کر نہ لایا جائے وہ لے ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑی دیر تک اس کی ماں قطار میں ٹھیر بھی نہیں سکتی تھی۔ لڑکھڑاتے قدم اور سانسوں کی تھرتھراہٹ اس کے سدِ راہ بن جاتے اور وہ واپس لوٹ جاتی اور جب گلابی رات کو گھر واپس لوٹتی اور ماں کی گود میں جا پہونچتی تو یوں لگتا جیسے وہ کسی الاؤ میں جل رہی ہے، اس کی ماں کا جسم بخار سے تپتا رہتا۔

انسان آرزوؤں، تمناؤں، اور خواہشوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے لیکن ان کی تکمیل اتنی آسان نہیں۔ کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے، آرزوؤں کو بے نقاب کرنے، تمناؤں کو حاصل کرنے خواہشوں کو تکمیل کرنے کے لئے دل پر کوڑے، لب پر آہیں اور آنکھ میں آنسو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

گلابی نے غم دیکھا نہ خوشی وہ ایک ایسی راہ کی مسافر تھی جہاں چاروں طرف آرزوؤں کے پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ کانٹوں کی چبھن سے ناآشنا وہ ان پھولوں کو توڑنے آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈوبنے کے خوف سے بے پرواہ وہ ایسے آبشار کے دہانے کھڑی تھی جس کے بہتے پانی نے اس کی پیاس کو اور بڑھا دیا خواہشوں کی رنگین وادی اُسے بلاتی رہی اور وہ سنہرے سپنے پلکوں پر سجائے مسکراتی رہی۔ معصوم اور بھولا بچپن تلخئ حیات اور غم روزگار کی چکی میں پس کر ستم دہر کو سمجھ نہ سکا۔ اس کی خواہشوں کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔

وہ رات کو اپنی ماں کی گود میں سر رکھے گھنٹوں فلک کے چاند کو تکا کرتی اور سوچتی کاش وہ کبھی اس کے آنگن میں اتر جائے۔ پھر چاروں طرف اجالا ہی اجالا، چاندنی ہی چاندنی ہو۔ پھر اس کی آنکھیں خواب سجانے لگتیں۔ تصور

کے اڑن کھٹولے پر بیٹھی وہ پریوں کی شہزادی بن جاتی۔ چاندی کے میز پر سونے کا تھال ہوتا جس پر سفید ابلے ہوئے انڈے، دودھیا مکھن لگے ٹوسٹ سرخ سرخ جیلی اور نہ جانے کتنے میوے سجے ہوتے وہ انھیں چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاتی اور تبھی ماں کی کھانسی اسے تصور کی حسین دنیا سے اٹھا کر حقیقت کی تلخ راہ داری میں لا چھوڑتی وہ حالات کی انگلی تھامے، حسرتوں کو کاندھے پر اٹھائے سفر زیست طے کرنے لگتی۔

اس دن بڑے سرکار کے دوست نے جو بمبئی سے آئے تھے اسے دو روپے بخشش دیئے۔ وہ خود کو بہت بڑی دولت مند سمجھنے لگی۔ اس کی ہتھیلی پر تو دس پیسے رکھنے کے لئے بھی اس کی ماں جھڑکتی تھی۔ اور یہ دو روپے اسے دو سو روپے سے زیادہ لگے۔ وہ خوشی خوشی گھر پہونچی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ دو روپوں میں اپنی من پسند چیزیں خرید کر رکھ لے گی۔

"کیوں ری۔ آج بڑی خوش ہے تو ___!" ماں نے گلابی کے چہرے پر شفق کے رنگ پھیلے دیکھ کر پوچھا۔

"اماں! آج مجھے دو روپے ملے ہیں"۔ وہ اپنی بند مٹھی دکھا کر کہنے لگی۔

"کہاں سے لے آئی تو۔ کہیں چوری تو نہیں کی۔ کسی سے مانگا تو نہیں ہے؟" ماں کے سوالوں کی بوچھار سے وہ ڈر گئی۔

"نہیں اماں۔ چوری کیوں کروں گی۔ یہ تو بڑے سرکار کے مہمان نے بخشش دی ہے میں نے ان کے کمرے کی صفائی کی تھی نا۔ جوتے پالش کئے تھے۔ رومال دھویا تھا، وہ خوش ہو گئے۔ اس نے دو روپے کی نئی نوٹ ماں کو دکھائی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے جا، دو دن سے میری گولیاں نہیں ہیں بازار سے خرید کر لے آ۔"

اس کی ماں کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر ماں کو دیکھا۔ جل ہی تو گئی وہ، یہ نہ سوچا کہ اسے کچھ اچھی چیز پکا کر کھلا دے، بس اپنی دوائی کی فکر کر لی، پتہ نہیں ہر کوئی اس کاغذ کے ٹکڑے کا دیوانہ کیوں ہے بیگم صاحبہ بڑے سرکار سے بس اسی کے لئے جھگڑا کرتی ہیں۔ نکّی بے بی اسکول جانے سے پہلے اس کے لئے ضد کرتی ہیں اس کی ماں کو بھی رات دن اسی کی فکر ہے مگر! وہ ان سوالوں کا جواب خود سے نہ پا سکی۔

"گلابی سنا نہیں۔ مجھے گولیاں چاہیئے۔ اب تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔" وہ بہ مشکل تمام کہہ سکی۔

نہ جانے کیا ہوا گلابی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مجھ سے زیادہ تو اماں کو اس کی ضرورت ہے اور پھر وہ ماں کے سرہانے رکھی چیتھی کو لے کر میڈیکل شاپ کی طرف چلی گئی صرف دو روپے میں چھے گولیاں آ گئی تھیں۔ اس نے سوچا اگر ہر روز اسے اسی طرح کی بخشش ملتی رہے تو اس کی ماں ہر روز دوا کھا سکے گی اور جلد ہی اچھی ہو جائے گی۔ پھر وہ کام کرنے لگے گی اسے اچھی چیزیں پکا کر دے گی، اسے اب یہ دھن سوار رہنے لگی کہ مہمان گھر آئیں اور اسے بخشش دیتے رہیں اور وہ اپنی ماں کی دوائیں لاتی رہے۔ ماں کی حالت دن بدن کمزور ہو رہی تھی مہمان کا انتظار اسے شدت سے رہنے لگا۔ اگر کوئی اتفاق سے آ بھی جاتا تو اسے بخشش نہیں ملتی۔ بھلا مقامی لوگ اسے کیوں بخشش دیں گے ہاں اگر کوئی دوسرے شہر کا مہمان ہوتا تو بات الگ تھی۔ اس کا جی کام میں نہیں لگ رہا تھا وہ ہمہ وقت مہمان کی آمد کا انتظار کرتی۔ بنگلے پر آنے والے ہر شخص کو وہ کھوجتی، دوڑ دوڑ

کر ان کا کام کرتی مانگنے سے پہلے پانی لا دیتی، چائے پلوا دیتی باادب، ان کے سامنے کھڑی رہتی۔ للچائی نظروں سے انھیں دیکھتی کہ شاید وہ کچھ مہربان ہو کر اس کے ہاتھ میں پیسے رکھ دیں۔ مگر صرف ایک جملہ ہی اسے سننے کو ملتا۔

"آپ کی یہ چھوٹی سی ملازمہ بڑی سلیقہ مند ہے۔ اتنی سی عمر میں اچھا کام کر لیتی ہے۔" وہ جل بھن جاتی۔ کیا ان لفظوں سے اسے ماں کی دوائی مل سکتی تھی؟ کاش وہ اس کی خدمت کے عوض، سلیقہ کے عوض کچھ پیسے ہی اس کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔

کئی دن گذر گئے کوئی مہمان نہیں آیا۔ اس کی ماں کی دوائی آنا مشکل ہو گئی۔ تیس روپے ماہوار اس کی ماں کی ہاتھ میں تھما دیئے جاتے۔ پرانے پھٹے کپڑے بھی مل جاتے ——— مگر بیماری کا تدارک تو علاج ہے۔ وہ کیسے ہو سکتا تھا نہ دوا ملتی نہ ہی غذا۔ اب اس کی ماں اس قابل بھی نہیں رہی کہ گھر بیٹھے کچھ کام کر لے اور دو روپے کمائے۔ گلابی کے قدم شعور کی منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور دل ماں کی بیماری سے گھبرانے لگا تھا۔ اب اس کے کام میں جوش باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ڈوبتے دل سے کام کر رہی تھی۔ اسے فکر یہ تھی کہ کاش کوئی اسے بخشش دینے لگتا تاکہ وہ ہر روز ماں کی دوائیں لے آتی۔ پھر اچانک ایک دن گھٹائیں گھر کر آئی تھیں۔ دن کا اجالا سرمئی اندھیرے میں بدلنے لگا تھا۔ موسم بھی کچھ سرد پڑ گیا تھا۔ اس کے گھر کی آدھی ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہوائیں باغیانہ طور سے اندر گھس رہی تھی۔ گلابی نے ماں کو پرانی کمبل اوڑھا دی تھی مگر پھر بھی وہ کانپ رہی تھیں۔ اس کا دل ماں کو چھوڑ کر جانے رضامند نہ تھا۔

"اماں آج میں بنگلے کو نہیں جاؤں گی۔"

"اری کم بخت ایسا نہ کر۔ اگر تو نہ گئی تو فاقہ ہو جائے گا۔ بیگم صاحبہ

سے کچھ پیسے ادھار مانگ کر لے آ۔ کہنا اماں کو آج انجکشن لگوانا ہے"۔ وہ ڈوبتے لفظوں کا سہارا لے کر کہہ رہی تھی۔

"کل ہی بیگم صاحبہ نے کہہ دیا کہ پچھلے ماہ کا حساب ہی پورا نہیں ہوا اور اس ماہ تنخواہ کٹ جائے گی۔" گلابی نے سہمے لہجے میں کہا۔

"تو جا تو سہی ——" ماں نے کہا۔

"مگر تو —— تو اکیلی ہے نا اماں۔ اور پھر تیری طبیعت تو کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔"

"تو میری فکر نہ کر۔ میں رحیمو بھیا کو بلا لوں گی۔ تو پہلے جا ——"

اور وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سارا دن وہ ٹھیک طور سے کام نہیں کر سکی۔ دل بے چین ہو رہا تھا۔ ماں کا خیال بار بار ستا رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ بیگم صاحبہ سے پیسے مانگ سکے۔

یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ ناشتے کے ٹیبل پر نکی بے بی کے ہاتھوں چائنا کا خوبصورت گلدستہ گر گیا اور اس کا الزام بڑی صفائی سے انھوں نے گلابی پر رکھ دیا۔

بڑے سرکار نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورا۔ بیگم صاحبہ نے دو چپت جم کے رسید کئے۔ وہ اپنے ناکردہ گناہ کی سزا خاموشی سے بھگت رہی تھی۔ اور جب بیگم صاحبہ نے اسے نکل جانے کہا تو وہ ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"نہیں بیگم صاحبہ۔ مجھے مت نکالئے۔ میں نوکری نہیں کروں گی تو میری ماں مر جائے گی۔ وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

نہیں نہیں —— مجھے اب تیری ضرورت نہیں۔ کم بخت نے سارا سامان برباد کر دیا۔ کتنی خواہش سے اسے میں نے خریدا تھا۔ ارے

تم لوگوں کو تمیز ہی کیا ہے۔ دیکھا ہی کیا تم لوگوں نے۔ زبردستی ہمارے گلے پڑ جاتے ہیں۔ دفع ہو یہاں سے۔" انھوں نے اس کا شانہ پکڑ کر پرے ڈھکیل دیا۔

وہ روتی بلکتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ وہ پیسوں کے لئے پوچھ سکے۔ اس کا ذہن پیسے کی فراہمی کے لئے بے چین ہو گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ ـــــ مار کی وجہ سے نہیں بلکہ ماں کی دوائی کے خیال سے۔ کیا کرے کہاں سے پیسے لائے۔ تبھی اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ نکی بے بی کی فیس کے ساٹھ روپے اس کی شرٹ کی جیب میں تھے جسے بیگم صاحبہ نے اسے ساتھ لے جا کر باندھنے کہے تھے۔ شاید غصے میں انھیں یاد نہ رہا اس لئے وہ اسے واپس لینا بھول گئے اس نے ہاتھ ڈال کر دیکھا تو کڑکڑاتے ساٹھ روپے اس کی جیب میں تھے۔ اس نے اپنے میلے شرٹ سے آنسو پونچھ لئے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے سوچا میری ماں اچھی ہو جائے گی، تو ان ساٹھ روپوں کے عوض وہ کام کرے گی اور اس طرح ان کے پیسے ادا ہو جائیں گے۔ فی الوقت تو وہ ماں کے انجکشن کا انتظام کرے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ گھر کی طرف دوڑ پڑی۔

"اماں تیری دوائی کی چٹھی کہاں ہے۔" وہ ہانپتی ہوئی کہہ رہی تھی۔
سرہانے ہی تو رکھی ہے۔ مگر...... مگر تو نوکری سے جلد کیسے آگئی؟"

"بیگم صاحبہ نے مجھے پیسے دیئے اور تیرے لئے انجکشن لگوانے کہا۔"
وہ بڑی صفائی سے جھوٹ کہہ کر میڈیکل شاپ کی طرف بھاگی۔

بتیس روپے کی دوائیں خرید کر رحیمو چاچا کے پاس پہونچی۔
"چاچا اماں کو انجکشن لگوانے ہسپتال جانا ہے"
"چل بیٹی میں آ رہا ہوں۔" رحیمو چاچا رکشا لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ بہ مشکل تمام گلابی نے محلے کی دوسری عورتوں کے ساتھ سنبھال کے

ماں کو رکشا میں بٹھایا اور ہاسپٹل کی طرف چل پڑی۔ ہاسپٹل میں وہی لمبی قطار تھی۔ وہ دوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔

"ڈاکٹر صاحب میری اماں کو پہلے انجکشن لگا دیجئے نا۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"اے لڑکی جا لائین میں ٹھیر جا۔ یہاں سبھی بیمار ہیں جلدی ہو تو کسی اور جگہ چلی جا۔"

وہ ہونٹ کاٹتی قطار میں ٹھیر گئی۔ اس کی ماں وہیں بنچ پر لیٹ گئی تھی۔ اس کی بے ترتیب سانسوں میں زندگی کے آثار مدھم پڑنے لگے تھے۔ دہشت اور گھبراہٹ سے گلابی کے معصوم چہرے پر سردی کے باوجود پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ایک ماں کی بیماری کا خوف تو دوسرے فیس کے پیسوں کو خرچ کرنے کا۔

اس کا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے دیکھا اس کی ماں کی گردن ڈھلکنے لگی تھی۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب پہونچی۔ اسی اثنا میں نرس نے اسے اسٹریچر پر ڈلوا دیا اور ایمرجنسی کی طرف لے گئیں۔

رحیمو چاچا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"چاچا ماں کو کیا ہو گیا۔ ——" وہ ان سے لپٹ گئی۔

اللہ مالک ہے بیٹی —— ! بوڑھے رحیمو چاچا کی آنکھیں بھی نمناک تھیں۔ تبھی ہاسپٹل کے گیٹ کے پاس کار نظر آگئی۔ بڑے سرکار کار سے اترے اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے، جیسے ہی ان کی نظر گلابی پر پڑی وہ تیز تیز قدموں سے اس کے قریب آئے، اسے گھسیٹ کر گیٹ کے پاس لے گئے اور بنا کچھ سوچے سمجھے ایک تھپڑ گلابی کے معصوم گال پر رسید کر دیا۔

چور نہیں کی ۔ نکی بیٹا کے فیس کے پیسے لے کر چمپت ہو گئی اسے اسکول میں ڈانٹ کھانی پڑی وہ روتی ہوئی گھر واپس آ گئی ۔

بڑے سرکار ...... میری ماں کی دوائی کے لئے ..... وہ پیسے میں نے رکھ لئے ۔ اسے انجکشن لگوا دوں گی وہ اچھی ہو جائے گی تو آپ کے پیسے لوٹا دے گی یا آپ کے گھر کام کر لے گی ۔ میں نے چوری نہیں کی ۔

"مجھے چور نہ سمجھئے یہ پیسے بچے ہیں" اٹھائیس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھے تھے ۔

تبھی ڈاکٹر نے آواز دی ۔

"اس پیشنٹ کے ساتھ کون ہے ...." رحیمو چاچا آگے بڑھے

"معاف کرنا ہم اسے بچا نہیں سکے ۔ لاش کو لے جانے کا انتظام کر لو۔" —— رحیمو چاچا کی آنکھیں برساتی ہو گئیں ۔ گلابی کو یوں لگا جیسے کوئی کانٹا اس کے کلیجے میں چبھ گیا ہو وہ تڑپ اٹھی ۔ ہتھیلی پر رکھے اٹھائیس روپے اس نے بڑے سرکار کے منھ پر پھینک دیئے اور رحیمو چاچا سے یوں لپٹ گئی جیسے وہی اس کے چارہ گر ہیں ۔ اس کی دل دوز چیخ اسپتال کو دہلا گئی یوں لگا جیسے بجلی تڑپ کر بے نقاب ہو گئی ۔ بادل دھیرے دھیرے برسنے لگے چمن کی ساری کلیاں بھیگنے لگیں اور گردش دوراں جاری رہا .....

کبھی نہ رکنے والا ——

کوہکن

اُس شام گھٹائیں گھر کر آئی تھیں۔ موسم کی پیش قیاسی کے تحت ساحلی علاقوں میں طوفان کا خطرہ تھا۔ سرد ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگی تھیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ پرندے گھبرا کر بسیرے کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ سڑکوں پر اتنی زیادہ ٹرافک بھی نظر نہیں آ رہی تھی جیسا کہ ہر روز حشرات الارض کی طرح سواریاں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ [illegible] قسم کے حادثات اور موت کی کارفرمائیوں کے باوجود زندگی سڑکوں سے لے کر گلی کوچوں تک بلکہ کوڑے کی ڈھیر میں بھی حرکت کرتی کیسے نظر آتی ہے۔ عقل بھی عاجز ہونے لگی ہے کہ آیا موت کو فاتح سمجھا جائے یا زندگی کو ـــــ عجیب جنگ ہے یہ، نہ زندگی شکست جانتی ہے اور نہ موت ہار مانتی ہے۔

روز کی طرح وہ کپڑوں کی دھول جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر کا راستہ طویل تو نہ تھا مگر پھر بھی جانے کیوں اس کے قدم تھکے تھکے سے ہو گئے مایوسی اور ناامیدی کے سیاہ لباس نے اس کے چہرے پر بھی ملگجی رنگ بکھیر دیا تھا۔ گھر کی دہلیز پر ہی اس کے پیر رک گئے۔ ماں کی کھانسی نے اسے احساس دلایا کہ وہ آج دوائیں نہ لا سکا۔ تبھی چوڑیوں کی کھنک نے اسے چونکا دیا کہ نیلو کے ہاتھ مہندی کے لئے بے قرار ہیں۔ آج پھر وہ ملتجی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے

اس کا استقبال کرے گی کیا وہ اس سے نظر ملا پائے گا۔ تبھی ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ اٹھا۔

"عامر بھائی آپ آگئے ـــــ آپ کے قدموں کی چاپ میرے سوا کوئی اور نہیں پہچان سکتا۔" نیلو چہک کر بولی۔ اور وہ تھکے ہوئے انداز میں صرف مسکرا سکا۔

"مایوسی کفر ہے اور ہمت ایمان۔ گولی ماریئے فکر کو اور چائے لیجئے گرما گرم۔" نیلو نے پیالی ہاتھ میں تھما دی۔

آگئے عامر ـــــ ماں کروٹ بدل کر اٹھ بیٹھی۔

ہاں اماں۔ وہ ماں کے قریب بیٹھ گیا۔

کیا ہوا ـــــ؟ ماں نے بڑی امید سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

کچھ نہیں ـــــ" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ لیکن یوں لگا جیسے فضا گھبرا گئی ہو۔ دیواریں دہل گئیں۔ فرش اکھڑنے لگے ہوں۔ سانس بوجھل ہو گئی۔ آس کے لاتعداد دیئے دھیرے دھیرے بجھنے لگے۔

اماں ـــــ وہ تھکے ہارے گھر آتے اور تم نے انھیں ـــــ"

خیر چھوڑو بھیا۔ یہ بتاؤ آج کہاں کی سیر کی ـــــ" نیلو نے اپنے دوپٹے سے اس کے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

سیر ـــــ! ہونہہ ـــــ وہ بے دلی سے مسکرایا۔

ناامیدی کے راستوں کی۔ مایوسی کے صحرا کی۔ بدقسمتی کے جنگل کی اور بے بسی کے لمبے راستے کی ـــــ"

افوہ عامر بھیا۔ تم کیا خاک سیر کرو گے۔ تم تو بس راہ چلتے چلتے تھک جاتے ہو۔ شیریں اور فرہاد کی کہانی تمہیں یاد ہے نا۔ فرہاد شیریں کے لئے

دودھ کی نہر کھود نے پہاڑ چلا جاتا ہے۔ بھلا بتاؤ! کیا یہ ممکن تھا مگر اس کی سچی لگن نے وہ کام کر دکھایا اور دودھ کی نہر بہہ نکلی۔ تم کیسے کوہکن ہو بھیا۔ تیشہ ہاتھ میں لیا بھی نہیں اور تھک گئے۔ تم نے زندگی میں کبھی کسی سے پیار نہیں کیا نا۔ اس لئے خود سے پیار کرنا سیکھو۔ سچی لگن دل میں رکھو۔ دولت کو شیریں سمجھو اور تم فرہاد بن کر اس کے لئے جوئے شیر لانے تیار ہو جاؤ۔ راہ کے پتھر اکھاڑ پھینکو اور اپنے لئے گلستاں بنا لو میں بلبل کی طرح تمہارے چمن کی ہر ڈالی پر چہکتی رہوں گی۔" نیلو نے بھائی کے دلاسے کے لئے کہہ تو دیا مگر وہ خود کو قفس کے پنچھی کی طرح محسوس کرنے لگی۔

رات گہری تاریک ہو رہی تھی۔ اور نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ کبھی ماں کی کھانسی اور کبھی نیلو کی چوڑیوں کی کھنک اسے بے قرار کر دیتے۔ صبح کی اولین ساعتوں میں جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے۔ رنگا تبھی نیلو اس کے قریب آئی۔

"آج اتنی سویرے کہاں چل دیئے بھیا۔ ——"

"میں ہر روز جس سفر کے لئے جاتا ہوں بس اسی کے لئے اور کیا۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"بنا کچھ کھائے ——" نیلو بولی

"کل صبح سے تو نے کتنی بار کھایا۔ وہ طنزیہ انداز میں مخاطب تھا۔

"میں نے روزہ رکھا تھا بھیا۔"

"غریبوں کے فلقے کا نام شاید روزہ ہی ہے۔ کونسی مراد بر آئی تیری۔"

"مراد پانے کے لئے ہی تو روزہ رکھا میں نے، آج تم مایوس

نہیں لوٹو گے مجھے یقین ہے۔"

"کاش تیرا یقین سچ ہو سکتا۔ مگر نیلو ـــــــ آج جیسے بھی ہو میں روپوں کا انتظام کر کے ہی آؤں گا۔" اس نے ایک عزم سے کہا۔

چوری نہ کرنا، ڈاکہ نہ ڈالنا، قرض نہ لینا محنت سے کما لانا۔ ماں کا علاج انہی پیسوں سے ہو سکتا ہے۔ نیلو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پیسہ ـــــــ پیسہ تو کسی بھی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی چھوٹی اور بڑی ضرورت صرف اس کی تابع ہے۔ پیسے کے حصول کے لئے اصولوں کا پابند ہو جانا میرے لئے صرف حماقت ہی ہے۔

میں تمہارا مطلب نہ سمجھ سکی بھیا۔

تو اس کی کوشش بھی نہ کر۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ نیلو واپس لوٹی تو ماں جاگ چکی تھی۔

عامر چلا گیا نا! ـــــــ ایک سرد آہ ان کے کمزور لبوں سے نکلی میری بیماری اور تیری شادی دونوں ہی اس کے لئے آزار ہیں۔ وہ تھک گیا بیٹی۔ دکھ کے اس پہاڑ کو کھودتے کھودتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے۔

میرا بچہ ـــــــ جب سے ہوش سنبھالا کوہکن ہی بن گیا۔ ماں کے باقی جملے کھانسی کی نذر ہو گئے۔ نیلو بڑی دیر سے اس ننھی چڑیا کو دیکھ رہی تھی جو پر پھیلائے اڑنے کی کوشش میں تھی۔ تبھی اسے یاد آیا۔

"اماں نسیمہ بی بی کے گھر آج دعوت ہے۔ انھوں نے بلایا چلی جاؤں"

"مگر عامر ـــــــ" ماں خوف زدہ ہو گئی

"مجھے اپنی بھوک کا خیال نہیں، تمہارے لئے کھانا مل جائے گا۔ صرف تمہارے لئے اماں"۔ وہ ماں کے گلے لگ گئی۔

اماں کے لب ہلے ۔ " اچھا ــــــــ " اور ایک آہ ان کے سینے سے نکل گئی گویا جلتے ہوئے گھر کا دھواں ہو ۔

شام سنولانے لگی عامر واپس آیا ۔ چوڑیوں کی کھنک سنائی نہ دی تو اس نے سوال کر ہی لیا ۔

" نیلو کہاں ہے ماں ــــــ "

" لاریوں والے سیٹھ بابو میاں کی لڑکی نے اسے بلایا تھا " ۔

" کیوں کس لئے ــــــ ؟ عامر کے لفظ پتھر بن گئے اور اماں کے دل پہ ضرب سی لگنے لگی ۔

" ان کے یہاں آج کچھ دعوت ہے اس لئے نیلو کو ــــــ کام پر بلالیا ــــــ " اماں چپ ہو گئیں

عامر نے محسوس کیا کہ تیشے کا وار خود اس پر چل گیا وہ زخم سے کراہ اٹھا ۔

نیلو کو کام کے لئے بھیج دیا ــــــ ہاں اماں ۔ میں نکما ہوں نا تم لوگوں کو دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتا ۔ تن ڈھانکنے کپڑا نہیں دے سکتا ۔ اب نیلو کمائے گی اور میں کھاؤں گا ــــــ گویا میں ایک بیکار سی شئے ہوں اس گھر میں ۔" وہ بڑبڑانے لگا ۔

عامر بھیا ۔ اماں پر کیوں بگڑتے ہو ۔ میں نے ان سے زبردستی اجازت لے لی ۔ تمہیں پتہ ہے اماں کو اچھے کھانے کی کتنی ضرورت ہے ۔ سوکھی روٹی اور چٹنی ان کے مرض کا علاج نہیں ۔ اگر میں ہر روز یہ کھانا نہ لاتی تو شاید آج اماں اس حال میں بھی نہ ہوتیں ــــــــ " قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہتی تڑاخ کے ساتھ عامر کی انگلیوں کے نشانات اس کے گالوں پر جم گئے ۔ ہاتھ میں تھما ہوا ٹفن گر گیا ۔

اماں سہم کر رہ گئیں اور نیلو کی سسکیاں فضا کو بوجھل کرنے لگیں۔

خبردار جو میری اجازت کے بغیر قدم گھر سے باہر نکالا۔ اتنا کہہ کر عامر باہر نکل گیا۔ نیلو ماں کی گود میں آگری اور اس وقت تک اس کے آنسو ماں کے دامن میں موتی لٹاتے رہے جب تک کہ آدھی رات نہ بھیگ گئی، عامر صبح کی اولین ساعتوں میں گھر آیا۔

"اماں مجھے نوکری مل گئی۔ اب میں رات کو شاید گھر نہ آسکوں۔ مجھے رات کی ہی ڈیوٹی ملی ہے۔ کام ہی ایسا ہے۔ نیلو لے یہ تھوڑا سا سامان کھانے کے لئے۔ اور سن، میرے قریب آ۔" وہ اس کے قریب پہونچی۔ گالوں پر انگلیوں کے نشانات اب بھی موجود تھے اور سانسوں میں سسکنا بھی جاری تھا۔

"نیلو، میں تیرا بھائی ہوں۔ تیرے بھلے کے لئے ہی کہتا ہوں۔ امیروں کی دولت ان کی تجوریوں میں ہوتی ہے اور غریبوں کی دولت اس کے اپنے آنچل میں اسے بہت احتیاط سے رکھنا پڑتا ہے۔ نیلو غریب کے آنچل کی بساط ہی کیا، بوسیدہ سا۔ ہلکے سے جھٹکے سے تار تار ہو جائے، اس لئے میری بہنا اسے سنبھال کر رکھ۔ یہ تیری دولت ہے اور تو میری دولت ہے ——" عامر نے اسے سینے سے لگالیا۔ نیلو کے اداس اور معصوم سے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی گویا سفیدیٔ سحر نمودار ہوئی ہو اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی گویا تیز دھوپ نکل آئی ہو.... عامر اس تمازت کو برداشت نہ کر سکا۔ اور واپس مڑ گیا۔

ہر رات دیر سے گھر آتا اس کا معمول تھا اگرچہ اس کے قدم لڑکھڑاتے ہوتے مگر جیب نوٹوں سے بھری رہتی۔ نیلو سمجھنے لگی تھی کہ اس کا بھائی دو نمبر کا دھندہ کر رہا ہے مگر وہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ کیونکہ پیسہ —— جو زندگی کی اہم ضرورت ہے اس کی ہر خواہش کی تکمیل کر رہا تھا نیلو کے لب سل گئے۔ ماں کے

چہرے کی زردی گہری ہوگئی اب دوا پھینکی جانے لگی تھی ۔ اور صبح خالی بوتل پھر ڈاکٹر کے گھر سے بھر کر آجاتی ۔ عامر نظریں چرانے لگا تھا ۔ ماں سے بات کرنے کا وقت ہی نہ تھا اس کے پاس ۔ وہ بس زندگی کی ضرورت پوری کر رہا تھا ۔ اسی بیچ نیلو کا رشتہ بھی طے ہوگیا ۔ اماں اس کا سہرا دیکھ کر مرنے کا انتظار کر رہی تھیں ۔ اور عامر وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہا ہے کیسے ـــــ اس کا جواب خود اس نے کبھی نہیں دیا ۔

زندگی کا مذاق آنکھ میں آنسو اور ہیں آہ بھر دیتا ہے ۔ ضرورت عامر سے شرافت خریدتی رہی ۔ دھوکہ ، بے ایمانی ۔ فریب اور دغا خریدتی رہی وہ دکھ کے پہاڑ کھودتا رہا ۔ دودھ کی نہر بہہ تو نکلی مگر گھاؤ کوہکن کے سارے جسم پر لگ چکے تھے ۔ عامر اپنے دام لگا چکا تھا ۔ سیٹھ سلیمان نے اسے اپنے کالے دھندوں میں پوری طرح استعمال کر لیا تھا ۔ گویا وہ ایک ایسی بیکار سی شئے تھا جیسے ہولی جلانے کے لئے الاؤ میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ وہ محض پیسے کا غلام اس لئے بن گیا کہ اسے نیلو کے ہاتھ میں کانچ کی نہیں ۔ سونے کی چوڑیاں پہنانی تھیں ۔ ویسے اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا جب نیلو کی ذمہ داریاں پوری ہو جائیں گی تو وہ اماں کے ساتھ حج کو جاکر اپنے سارے گناہوں کی معافی مانگ لے گا ۔ مگر قسمت نے اسے دھوکا دیا ۔ ٹھیک اسی دن جس دن نیلو کی برات آئی تھی پولیس اس کی تلاش میں گھر پہنچ چکی تھی اور وہ سارے مہمانوں کے سامنے ہتھکڑیاں ہاتھوں میں ڈالے پولیس کی ویان میں بیٹھ گیا ۔ چپ چاپ نہ اس نے التجا کی نہ وہ رو سکا ۔ اور نہ کسی بات کا انکار کر سکا ۔ جرم اس نے کیا تھا اور اسے سزا ملنی ہی تھی ۔ بارات لوٹ گئی ۔

اماں کی اکھڑی اکھڑی سانس بیٹی کی خوشی کو ہی مشکل سے سہار رہی

تھیں کہ بیٹے کے غم سے رک ہی گئیں۔

عامر کو سزا ہو چکی تھی چھ ماہ کی۔ سیٹھ سلیمان نے اس سے وعدہ کر لیا کہ چھ ماہ تک وہ اس کے گھر والوں کی حفاظت کرے گا۔ یہ ایک طرح کا سودا تھا، کیونکہ عامر نے ان کے جرم اپنے نام کر لئے تھے۔ اس کے بدلے اس کی زندگی کی ساری محنت کا صلہ اسے مل رہا تھا۔ وہ دکھی بھی تھا اور سکھی بھی۔ ماں کی موت ویسے بھی اٹل تھی اس کی گرفتاری بہانہ بن گئی۔ وہ موت کی شاطرانہ چال پر ہنس پڑا۔ سیٹھ سلیمان سے معاہدے کے بعد وہ اس بھروسہ کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید ہو گیا کہ ماں کی تدفین اور نیلو کی شادی دونوں ہی کی ذمہ داری سیٹھ سلیمان نے قبول کر لی۔

بہار و خزاں کے دن گذرے۔ چڑھتے سورج اور ڈوبتی شام کا ملن ہوتا رہا۔ جیل سے رہائی پاتے ہی وہ سب سے پہلے ماں کی قبر پر پہنچا۔ سنگ مرمر کے خوبصورت سے چبوترے پر اس کی ماں ابدی نیند سو رہی تھی۔ سرہانے چنبیلی کا گھنا منڈوا بھی تھا۔ زندگی میں تو اس نے ماں کو معمولی سا پتھر کا فرش بھی نہ دے پایا تھا۔ وہ لال مٹی سے لیپ کر ہی خوشنما بنا لیا کرتی تھی اور اور آج موت نے کتنی عزت بخشی تھی ان کو۔ کوئی دیکھتا تو ضرور یہ سوچتا کہ کسی بڑے گھر بڑے رتبہ والوں نے بنایا ہے۔ اگرچہ وہ خود مٹی کی تہہ میں دبی پڑی تھی یہ محض دنیاوی دکھاوا تھا۔ موت نے کبھی ہار مانی ہی نہیں۔ وہ مار کر بھی زندہ رکھ دیتی ہے قبر کی شکل میں ماں کی قبر سے نکل کر جب وہ سڑک کی طرف آیا تو یوں لگا جیسے وہ کسی اجنبی شہر میں آ گیا۔ کوئی بھی شناسا نہ تھا۔ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا اسے۔ ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ۔ مٹی کا مکان، ماں کی کھانسی کی آواز، نیلو کی چوڑیوں کی کھنک۔ سب کچھ اسے یاد آ گیا اور پھر اس کے آنسو

بھینے لگے ۔ بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھا روتا رہا۔ شام کے سائے جب تیزی سے
زمین کی طرف آنے لگے ۔ تب کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا یہ شرما تھا۔
سیٹھ سلیمان کی شطرنج کا دوسرا مہرہ اس کا اپنا ساتھی ۔
"دوست ، ہماری زندگی رونے کے لئے نہیں۔ اتنے زمانے تک ہمارے
ساتھ رہ کر بھی تم پتھر کا دل اور فولاد کا جگر نہ لاسکے ۔ تمہارے ماتھے پر جو کلنک لگ
چکاہے وہ آنسوؤں سے دھویا نہیں جاسکتا ۔ اٹھو اسی راستے پر چلو۔ جو تمہارا
مقدر بن گیا ہے ۔ ہماری اپنی کوئی زندگی ہی نہیں ۔ ہم نہ خود کے لئے جیتے ہیں نہ خود
کے لئے مرتے ہیں ۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھوڑے دے دیئے گئے ہیں ۔ اور ہم وقت
کی چٹانوں کو کاٹ رہے ہیں ۔ ہمیں ضرورت ہے دولت کی اور انھیں ضرورت ہے
ہمارے ہاتھوں کی ، ہمارے جذبات اور احساسات انہی چٹانوں کے ساتھ کچلے
جاچکے ہیں ۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے چلو میں تمہیں وہاں لے چلتا
ہوں جہاں ہم جیسے لوگوں کو تھوڑی سی پناہ مل جاتی ہے"۔ شرما کے ساتھ وہ چپ
چاپ چل پڑا ۔

"یہاں شراب بھی ہے اور شباب بھی ۔ تم یہاں آکر خود کو ہر فکر سے
آزاد پاؤ گے"۔ شرما نے ایک خوبصورت سے مکان میں داخل ہوتے ہوئے اس سے
کہا۔ دونوں ایک وسیع ہال میں پہنچے جہاں بہت سلیقے کے ساتھ فرش کیا گیا تھا
دالان کے چاروں جانب مختلف قسم کی شراب کی بوتلیں موجود تھیں ۔ عامر تیزی
سے ایک میز کی جانب بڑھا اور ایک ہی سانس میں ساری بوتل ختم کر دی ۔ گویا
وہ جلد سے جلد غموں سے نجات پانا چاہتا ہے ۔

"ارے یار تم بھی کس قدر جلد باز ہو کچھ تو انتظار کرتے ۔"
ابھی ایک حسین ، مہ جبیں ۔ دل نشیں تمہارے سامنے پیمانہ لئے

پہ چلی آئے گی۔ اس کے آنچل کو چہرے سے ہٹا کر سوچو گے کہ پیمانہ کونسا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں اس کے آنکھوں میں اس کے گالوں میں یا پھر اس کی لبوں پر۔ ہاں قسم یار سر سے قدم تک نشہ ہے۔"

شرما کی اس آواز پر چھم چھم کی صدا اٹھی اور ایک نازک خرام حسینہ چہرے پر نقاب ڈالے ہاتھوں میں پیمانہ لئے اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ عامر نے دھیرے سے اس کا آنچل اٹھایا اور پھر ایک دھماکہ ہوا۔ ایک لاوا ابل پڑا۔ ایک پہاڑ پھٹ گیا۔ نیلو ــــ نیلو ــــ نیلو ــــ گویا سارا ہال بازگشت کرنے لگا۔ عامر آنکھیں مل کر کھڑا ہو گیا۔ شرما۔ ہکا بکا اسے دیکھنے لگا اور نیلو کے ہاتھ سے پیمانہ چھوٹ گیا۔

"بھیا ــــ" اس کے الفاظ پوری طرح ادا بھی نہ ہو پائے کہ شیشے کی تیز دھار اس کے سینے میں چبھ گئی، خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ تیورا کر فرش پر گر گئی۔ عامر کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا شیشہ تھا۔

"میں فرہاد ہوں۔ کوہ کن ہوں، لیکن میں نے دودھ کی نہر نہیں نکالی خون کی نہر کھودی ہے۔" ایک بھیانک قہقہہ گونجنے لگا۔ دوسرے ہی پل شرما بھی فرش پر تڑپ رہا تھا۔

"میں فرہاد ہوں۔ خون کی نہریں کھودتا ہوں۔" وہ بے تحاشا قہقہے لگاتا رہا۔ صبح سویرے اخبار کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں خبر آئی۔ "ایک بھائی کے ہاتھوں بہن کا بیدردانہ قتل۔ قاتل نے دوست کا بھی قتل کر دیا۔ پتہ چلا کہ ملزم پاگل پن کا شکار تھا۔"

اب خدا جانے پاگل عامر تھا۔ یا شرما، یا سیٹھ سلیمان ــــ یا نیلو ــــ یا پھر یہ سماج ــــ

کنارے بے وفا نکلے

کار تیزی سے پورٹیکو میں آکر رکی۔ موون ملز کے مالک ممتاز احمد کار سے اترے۔ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ جیسے سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن کر زمین پر گرتی ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا تھا۔ بالوں کی سفید موجیں بڑے دلکش انداز میں سنواری گئی تھیں۔ ماتھے پر ہلکی سی شکن، لبوں پر خاموش کہانیاں اور دھویں کے مرغولے بناتا ایک پائپ۔

"پیٹر ـــــ" ایک گرجدار آواز ان کے لبوں سے نکلی۔

"یس سر ـــــ" پیٹر مودبانہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اس ایک ماہ کے دوران میرے لئے کوئی آیا تو نہیں ـــــ؟" انھوں نے سوال کیا۔

"نو سر ـــــ" اس نے سر کو خم کر کے کہا

"ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر ٹیبل پر رکھے خطوط پر پڑی۔ انہوں نے چشمہ اتارا چھڑی نوکر کے حوالے کی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر لفافے چھانٹنے لگے۔ دفعتاً گلابی رنگ کے لفافے کو دیکھ کر وہ کچھ چونک گئے۔ لفافے سے نکلتی بھینی بھینی

خوشبو نے انھیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

یہ کس نے لکھا ہے بھلا ——— انھوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ڈاک کے ٹکٹ پر چندن نگر کا مہر پڑا تھا۔ وہ کچھ جھجکے کچھ رکے اور پھر تیزی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے کئی پرچوں پر مشتمل ایک خط نکلا۔ ان کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ ان کی بے چین نظریں تحریر پر جا کر رک گئیں۔

"پاپا ———

زیارت کو نگاہیں منتظر ہیں
قدم بوسی کو راہیں منتظر ہیں

اس خط کو دیکھ کر یقیناً آپ چونک گئے ہوں گے۔ میں شادماں ہوں پتہ نہیں آپ اس نام سے واقف ہیں بھی یا نہیں۔ میں وہی گوشت کا ٹکڑا ہوں پاپا جسے آپ نے آج سے اٹھارہ سال پہلے یہ کہہ کر ممی کے حوالے کیا تھا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں ———"

"آپ کرتے بھی کیا۔ آہن و فولاد بھلا کر یہ شبنم سے پگھلتے بھی ہیں۔" ممی کی سسکتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اذان تو آپ کو دینی چاہیئے تھی نا! مگر مجھ بدنصیب کی قسمت ماں کی ہچکی سننی لکھی تھی۔

مجھے یاد ہے پپا ——— بابا نے اپنی بیٹی کی خاطر آپ کے آگے ہاتھ جوڑے تھے مجھے سفید کپڑوں میں لپیٹ کر آگے رکھا اور گھگھیاتے ہوئے کہا تھا۔

"ممتاز بیٹا! خدا کو یوں نہ بھولو۔ اس معصوم کلی کو پھول بننے دو اسے اس طرح چھوڑ کر نہ جاؤ۔ دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بیٹا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ چلو اس کی ماں تمہاری راہ تاک رہی ہے۔" لیکن آپ نے منہ پھیر لیا۔

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں مجھے تنگ نہ کیجئے۔ ورنہ میں کوئی دوسرا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ میں نے اس سے بیٹا مانگا تھا۔ بیٹی لے کر کیا کروں گا۔" اتنا کہہ کر آپ تیز تیز قدموں سے باہر چلے گئے۔ آپ کے قدموں کو چاپ میں بھول نہیں پائی۔ دل کی دھڑکن بن کر وہ آج بھی میرے قریب ہے۔

اس رات آپ غائب ہو گئے ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر میں سمجھ بھی نہ سکی کہ میری دنیا کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ ایک اکیلا چاند مجھے کب تک سنبھال سکتا کبھی تو مجھے اجالوں کی آرزو ہوتی۔

پپا ـــــــ ماں اور باپ تو ندی کے دو کنارے ہوتے ہیں لہریں انہی کناروں کو چھوتی ہیں، اور پھر ندی میں ڈوبتی ابھرتی ہیں۔ میں کتنی بدنصیب ہوں کنارے مجھے چھوڑ گئے

ممی کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں جیسے سارا ساون یہیں آگیا ہو وہ جب بھی میرے پالنے کے پاس آتیں مجھے حسرت سے دیکھتیں اور کہتیں۔

"تو بدنصیب ہے مجھ سے زیادہ ـــــــ" اس کے بعد ان کے الفاظ آنسوؤں میں ڈوب جاتے۔ میں انگوٹھا چوستی ہوئی سوچتی رہی۔ یہ سب کیا ہے ـــــــ کیا دنیا ایسی بھی ہوتی ہے۔ جہاں آبادی کے باوجود ویرانے کا گمان ہوتا ہے۔ معصوم کلیاں شبنم کے موتی دامن میں چھپانے کے باوجود بدنصیب کہلاتی ہیں۔

آپ نے گھر چھوڑا، شہر چھوڑا۔ اور رات کی تاریکی کی نذر ہو گئے۔ میں نے پڑھا ہے کہ گوتم من کی شانتی کے لئے پونر آتما کی تلاش کے لئے راتوں رات اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن آپ

آپ تو دھن کے گوتم نکلے۔ دھن کے لئے گھر بار چھوڑا۔ رشتے

توڑے ـــــــــ۔"

معاف کیجئے گا میں بہکنے لگی ہوں۔ اس رات ممی رو رو کر اپنے بابا سے کہہ رہی تھیں۔

ابا جان۔ میں ایسی ہی بوجھ ہو چلی تھی تو مجھے کنوئیں میں ڈال دیا ہوتا۔ یوں روز روز کے مرنے سے تو ایک دن کا مرنا بہتر ہوتا۔ یا پھر کسی فقیر کے پلے ہی بندھوا دیتے مجھے۔ کیوں اپنی نظر کی حد سے آگے دیکھا آپ نے جب مانگ پوری نہ کر سکتے تھے تو وعدے کیوں کئے۔ میری زندگی تو خیر گذر ہی گئی مگر میرے بعد اسے کون سنبھالے گا۔ کون تھامے گا اس کا ہاتھ۔ ـــــــ"

انھوں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا تھا۔ کبھی گرتی کبھی سنبھلتی ممی کے پاس پہونچی۔ ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ جب میری انگلیاں گیلی محسوس ہوئیں تو میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور تالیاں بجانے لگی۔

ممی نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ بھیگی پلکوں میں ان کی مخمور آنکھیں ایسے لگیں جیسے پہلی بارش میں دھلی ہوئی گلاب کی سرخ کلی۔

"میری بچی ـــــــ ان کی ڈوبتی ابھرتی آواز میں نے سنی۔" میں زندہ رہوں گی۔ تیرے لئے صرف تیرے لئے۔ انھوں نے مجھے بھینچ لیا۔ میں نے ان کے سینے پر رکھا اپنا سر اٹھایا اور ان کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔ مجھے غم کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ کاش میں جان سکتی کہ یہ غم ان کو کس نے دیا تھا ـــــــ؟

دیر تک میں ان کے گالوں کو سہلاتی رہی۔ میرے ہاتھ گیلے ہوتے رہے یوں لگا جیسے میں نے کسی پانی سے بھرے ٹب میں اپنی انگلیاں ڈال رکھی ہوں

اس دن میں پورے چار برس۔ چار ماہ اور چار دن کی ہو گئی کہنے کو یہ

صرف چار سال تھے مگر شاید ممی کے لئے چار صدیاں ——— میرے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی مجھے جھلملاتا جوڑا پہنایا گیا تھا ۔ ممی الماری کے قریب ٹھیری ہوئیں تھیں ۔ ان کی سسکیاں فضا کو مرتعش کر رہی تھیں ۔ میں نہ جانے کیا سوچ کر ان سے لپٹ گئی کوئی چیز ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی اور "چھن" کی آواز پر میں نے چونک کر دیکھا ۔ یہ ایک تصویر تھی جس کا فریم ٹوٹ چکا تھا ۔

"ممی ۔ یہ کون ہے ———" میں نے تصویر پر انگلی رکھ کر پوچھا

"یہ تیرے پاپا ہیں ———" ممی نے کانچ کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے کہا ——— "پاپا کسے کہتے ہیں ممی ———" ایک معصوم سا سوال میں نے کیا

"جیسے میرے بابا ہیں"

تو پھر وہ ۔ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلاتے ۔ پیار کیوں نہیں کرتے ۔ میں نے منہ بسورنا شروع کیا ۔

"نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے ۔ دیکھو میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں ۔"

بابا نے مجھے گود میں اٹھا لیا ۔ میں نے دیکھا وہ رو رہے تھے ، ممی سسک رہی تھیں ۔ میں نے معصوم نظروں سے ان دونوں کو دیکھا اور یہ خیال کیا کہ شاید میں نے کھولتا ہوا تیل ان پر ڈال دیا ہو یا پھر کوئی سلگتی لکڑی داغ دی ہے ——— معصوم جو تھی اور کیا سمجھتی اس کے سوا ۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ ممی سرخ دوپٹے میں آنسوؤں کی سوغات ہی لے کر آئی ہیں اور میں پیدا ہوتے ہی ان آنسوؤں کے موتی چننے لگی ہوں ۔

"یہ بدنصیبی کس کی ہے پاپا ———"

وقت کی بوندیں لمحہ لمحہ کر کے ٹپک رہی تھیں ، موسم بیتتے رہے گرمیوں کی دھوپ نے جھلسایا تو سردیوں کی ٹھنڈک نے ٹھٹھرا دیا ۔ بارش نے

ہمارے اثاثے کو لوٹ لیا۔ اس رات طوفانی بارش تھی۔ ہمارا بوسیدہ مکان دھماکہ کے ساتھ گر پڑا۔ میں اور ممی تو بچ نکلے مگر بابا نیند کے ساتھ موت کے گلے مل گئے زمانے اور وقت کی ٹھوکر کھانے کے لئے میں اور ممی رہ گئے۔ میں اپنی عمر کی بارہویں منزل ختم کرنے ہی والی تھی۔ اس حادثے نے ممی کو دہلا دیا اور مجھے سہما دیا۔

میرا شعور احساس کی گھاٹیوں سے گذر رہا تھا۔ میرا معصوم بچپن ماضی کے حادثوں سے بوڑھی جوانی میں بدلنے لگا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اب میں انگوٹھا چوسنے والی، گڑیوں سے کھیلنے والی۔ آنسو کو پانی سمجھنے والی ننھی نادان نہیں بلکہ زندگی کے تلخ تجربات کو سمجھنے اور پرکھنے والی سیانی لڑکی ہوں۔ میرے دل نے اب مجھ سے باتیں شروع کر دی تھیں۔ رہ رہ کے مجھے وہ آپ کی یاد دلواتا میں نے کان بند کر لئے مگر اس کی دھڑکن بند نہ ہوئی۔ اور ایک بار مجبور ہو کر میں نے ممی سے پوچھ لیا۔

"ممی ـــــ زندگی کی یہ ناؤ کب تک یونہی طوفان میں ہچکولے کھاتی رہے گی کیا اس کو کبھی کنارہ ملے گا یا نہیں ـــــ"

بڑی باتیں کرنے لگی ہے اتنی عقل کہاں سے آگئی تجھ میں ـــــ"

وہ کپڑے سیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ لائٹ کی دھیمی دھیمی روشنی تھی، ان کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور وہ آرڈر پر اپنا کام مکمل کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اب سفیدی میں بدلتے جا رہے ہیں۔

ممی ـــــ احساس کا سبق کسی کتاب سے نہیں ملتا۔ عقل عمر کا تحفہ ہے۔ کیا زندگی کے گذارے ہوئے لمحے میں بھول گئی ہوں۔ ان بارہ برسوں سے اپنے پاپا کی صورت کو ترس کر رہ گئی۔ میرا بچپن اوروں کی طرح باپ کے

نازوں کا پالا نہیں۔ سب یہی جانتے ہیں کہ پاپا بزنس کے لئے آفریقہ میں رہتے ہیں
اور تین چار سال میں ایک بار یہاں آجاتے ہیں۔ آپ نے تو بات نبھادی۔ مگر میں یہ
جھوٹ کیسے برداشت کرلوں۔ اپنی عمر کی ایک ایک سیڑھی پر میں نے آپ کی
انگلی تھام کر قدم رکھے ہیں۔" میں نے کتاب بند کردی اور بحث پر اتر آئی۔

"شادماں۔ تجھے ان باتوں سے کیا واسطہ۔ بس —— تیری شادی
ہوجائے۔ مجھے بھی سکون مل جائے گا اور تجھے بھی۔

یہ تھے وہ الفاظ جو ممی نے مجھ سے کہے حالانکہ —— یہ تو آپ
کو کہنے چاہیئے تھے پھر آپ کے خون نے یہ احساس کیوں نہیں دلایا کہ جس گوشت
کے ٹکڑے کو آپ سات دن کی عمر میں چھوڑ گئے وہ اب سترہ برس کے ایک مجسمے
میں ڈھل کر وقت کی دہلیز پر کھڑی آپ کی راہ تک رہی ہے۔

کاش آپ کا دل میرے لئے ایک بار دھڑکتا۔ کاش کبھی آپ
اپنے آنگن میں کھلے گلاب کی خوشبو کو محسوس کرسکتے۔

ممی کا جواب سن کر غیر ارادی طور پر میرے منھ سے نکل گیا۔
"ہر لڑکی سسرال جاتے ہوئے بابل کی دعائیں لیتی جاتی ہے۔ میری
قسمت میں دعا ہی نہ ہو تو سکون کہاں ملے گا۔" میرے اس جملے پر وہ چونک گئیں
سوئی ان کی انگلی میں چبھ گئی۔ خون بہتا دیکھ کر میں نے جلدی دوپٹے سے ان کی
انگلی صاف کی۔

"تو نے اس زخم کو تو دیکھ لیا۔ مگر میرے دل کا وہ گھاؤ جو آج سترہ
برس سے رس رہا ہے اسے کون مندمل کرے گا۔" اور پھر ان کی آنکھوں سے
تسبیح کے دانے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ٹپا ٹپ کئی آنسو ان کے دامن میں گر پڑے،
میں نے اس دامن کو آنکھوں سے لگالیا۔

ممی مجھے معاف کر دو ۔ میں نے آپ کو دکھ پہونچایا ــــــ"

میں ان کے سینے سے لگ گئی ۔

"شادماں ۔ جس دن تیرے ہاتھ مہندی لگے گی ۔ تیری مانگ افشاں سے جگمگائے گی اس روز تیرے پاپا ضرور آئیں گے میں تجھے ان کا پتہ دوں گی"

ممی نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا ۔

پاپا ــــــ کتنے پتھر دل ہیں آپ ــــــ ایک بار بھی میری خبر نہ لی ۔ کیا چمن کا باغباں کلیوں کو گل چیں کے ہاتھوں مسلے جانے کے لئے ایسے ہی چھوڑ جاتا ہے ۔

ممی آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں ۔ ایک بار انہوں نے خط بھی لکھا تھا مگر آپ نے جواب دیا میرے لئے سب مر چکے ہیں ۔

کیا واقعی شادماں آپ کے لئے مر چکی ہے پاپا ــــــ جس ننھی سی جان کو ممی نے محنت کر کے پالا بڑھا کیا ۔ اس کی خاطر ہر امتحان سے گذریں اور کبھی بھولے سے ماتھے پر بل نہ لایا ۔ ایسی محنت سے سینچے ہوئے پودے کے لئے آپ نے کہا کہ وہ مرجھا گیا ہے اس کا کوئی وجود نہیں ۔ ممی یہ برداشت نہ کر سکیں اور پھر انھوں نے دوسرا خط نہ لکھا ۔

پاپا ــــــ دنیا میں خوش نصیب تو ماں باپ کے سہارے جیتے ہیں مگر مجھ جنم جلی کے حصے میں محرومیاں ہی آئیں ۔ آپ ہمیں اس سنگلاخ وادی میں سر پھوڑنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے اور خود نہ جانے کیسے اتنے بڑے آدمی ہو گئے ۔ آپ دولت کے پجاری تھے روپیہ آپ کا ایمان تھا ۔ میں نے سنا کہ آپ نے ایک رئیس کی اکلوتی لڑکی سے جو دل کی مریضہ تھی شادی کر لی اور اس کے مرنے کے بعد ایک بہت بڑی کمپنی کے مالک ہو گئے ۔

"سچ کہنا پاپا ــــــ ان سترہ برسوں میں آپ نے سچی مسرت کبھی حاصل کی۔ نہیں پاپا ــــــ چاندی کی دیواریں، سونے کے چھت شاید خوشیاں دے سکتے ہوں مگر روح کی تسکین یہاں نہیں ملتی۔ یہ تو پیار و محبت کی بستی میں ملتی ہے مگر آپ کو پیار نہیں پیسہ چاہیئے تھا نا! ورنہ ممی کی اداس آنکھیں اور میری کلکاریاں آپ کو کبھی کا روک لیتیں۔

مجھے یاد ہے ایک بار میری سہیلیاں میرے گھر آئیں ممی سے مل کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ اور مجھ سے پوچھا۔

شادماں۔ تیری ممی کتنی پیاری ہیں، تجھ سے بہت پیار کرتی ہیں نا تیرے پاپا بھی تو تجھ سے پیار کرتے ہوں گے پھر وہ اتنی دور کیوں ہیں ــــــ" ممی کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔

"ان کا بزنس ہی ایسا ہے۔ ورنہ سارا کاروبار بگڑ جاتا ہے۔ اپنی بیٹی سے ملنے تو وہ سال میں ایک بار کسی صورت آہی جاتے ہیں ــــــ کیوں شادماں ــــــ؟" انہوں نے میری جانب ایسی نظروں سے دیکھا، جن میں کرب ہی کرب تھا۔

"ہاں ہاں ــــــ ممی ٹھیک کہتی ہیں"۔ میں نے زبردستی گردن ہلا دی۔ اپنی سہیلیوں کے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان سے پوچھ لیا۔

"آپ نے جھوٹ کیوں کہا؟ کب تک ہم ایسے ہی تسلیوں سے جیتے رہیں گے۔"

بس کچھ دن اور ــــــ" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

اور کتنے دن ــــــ؟ ساری عمر تو آپ نے سجدوں میں گذار دی لیکن پیشانی پر داغ بھی نہیں آیا۔ یہ قصور آپ کے سجدوں کا نہیں

اس سجدہ گاہ کا ہے جہاں آپ کی یہ پیشانی جھکتی ہے۔"

گستاخی معاف ——— میں نے آپ کی تصویر کی جانب انگلی اٹھا دی۔

تو ناسمجھ ہے پگلی ——— بھلا داغ کے لئے کوئی سجدہ کرتا ہے

اگر ایسا ہے تو پھر یہ ریاکاری ہے۔

"فریب ہے عبادت نہیں ———" وہ ہنس کر بولیں۔

دیکھا پاپا ——— کتنی چاہت، کتنا پیار اور کتنی محبت ہے ان کو آپ سے۔

کاش آپ کے سینے میں پتھر کی جگہ دل دھڑک سکتا۔ لیکن اس میں آپ کا کیا قصور جہاں چاروں طرف دولت کا گہرا سمندر ہو بھلا اس کو پار کر کے کوئی کہاں سے کنارے تک پہونچے گا۔

آج ممی بڑی خوش ہیں۔ آج میری اٹھارویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ انہوں نے ایک خوبصورت لاکٹ سب کے روبرو میرے حوالے کیا اور کہا کہ یہ آپ کا تحفہ ہے میں نے چونک کر ان کو دیکھا وہ کچھ ایسی ادا سے مسکرائیں کہ میری آنکھوں کے سوتے چشمے ابل پڑے۔ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میرا سر سہلاتی ہوئی وہ کہنے لگیں۔

"شادماں ——— اب چند ہی دن میں تو پرائی ہو جائے گی۔ میری محنت کا ثمر مجھے مل جائے گا۔ میری مایوس نگاہیں تیرے چہرے پر سہرے کی لڑیاں دیکھنے بے تاب ہیں۔"

"ممی ———" مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ——— "نہیں ——— میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

میں ان سے لپٹ گئی ، ایسے ہی جیسے کوئی بیل کسی تناور درخت کو سہارا سمجھ کر لپٹ جاتی ہو۔

"پگلی ـــــــ لڑکی تو پرایا دھن ہوتی ہے ۔ میں کب تک امانت کو سنبھال کر رکھوں گی ۔" انہوں نے میرے گال تھپتھپائے ۔ مجھے جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ۔

"ممی ـــــــ آپ اور پاپا مل کر ہی مجھے وداع کریں گے نا !"

جیسے صحرا میں پپیہا پکار اٹھے ۔ میں نے کہہ دیا ۔

"ہاں ضرور ۔ وہ بھی آئیں گے تجھے رخصت کرنے ۔ اب میں تجھے مایوس نہیں کروں گی ۔ بڑی دیر صبر سے برداشت کرتی رہی ۔ میری جنگ کا یہ آخری مرحلہ ہے ۔ یہ لے اپنے بابا کا ایڈریس ۔" ممی نے میرے ہاتھ ایک وزیٹنگ کارڈ تھما دیا ۔ یہ آپ کا نام تھا ۔

آپ جو ایک دولت مند انسان ہیں ۔ مون ملز کے تنہا حقدار ، شہر کی ایک معزز شخصیت ، سوسائٹی کے ایک باوقار سماجی کارکن ۔ کاش ان سب کے علاوہ آپ ایک شفیق باپ ہوتے ۔

میں نے ممی کے دیئے ہوئے ایڈریس پر ہی یہ خط لکھا ہے ۔

مجھے یاد ہے ممی نے قلم میرے ہاتھ میں تھما کر کہا تھا ۔

"تیری تحریر ایسی ہو کہ پتھر پگھل جائے ، لوہا موم ہو جائے ، آگ پانی بن جائے اور خون کو جوش آ جائے ۔"

میں نے کوشش تو کی ہے پتہ نہیں اس میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں ۔

دیکھنے یہ سچ ہے کہ میرے اشہب قلم نے کہیں کہیں بڑی برق

رفتاری دکھادی اور گستاخیوں کے میدان میں آگیا۔ پھر بھی التماس ہے کہ اسے نظرانداز کر دیں۔ یہ ایک ناز ہے جو اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ آج دل قابو میں نہیں رہا۔ خون نے سیاہی کا روپ لے لیا۔ انگلیاں قلم بن گئیں اور درد الفاظ میں ڈھل گیا۔

مجھے معاف کر دیں اس یقین کے ساتھ صبح کے اجالوں اور شام کے دھندلکوں میں دہلیز پہ بیٹھی انتظار کر رہی ہوں کہ آپ ضرور آئیں گے اپنی شادماں کو وداع کرنے

آپ کی
شادماں

خط ختم کرتے ہی ممتاز احمد کی آنکھیں چھلک چھلک کر آنسوؤں کے دائرے تحریر کو مٹانے لگے۔ اور ان کے ذہن پر نقش بن بن کر بگڑنے لگے انہوں نے دستی سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی بچے کی طرح بلک کر رو پڑے۔ دل کا غبار چھٹ گیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے یوں لگا جیسے بارش کے خوب برس جانے کے بعد دھوپ کھل کر بکھر گئی ہو۔

انہوں نے کار نکالنے کا حکم دیا۔ خط پر دوبارہ نظر ڈالی تو اس پر ۲ر جنوری کی تاریخ پڑی تھی اور آج ۸ر فروری تھی۔ ان کے دل میں کچھ عجیب سے شکوک پیدا ہوئے۔ انہوں نے تیزی سے چشمہ چڑھایا۔ چھڑی ہاتھ میں سنبھالی اور کار میں جا بیٹھے۔ ڈرائیور کو چندن نگر چلنے کا حکم دیا۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی تھی اور وہ ماضی کے کھنڈروں میں بیتے لمحے تلاش کر رہے تھے۔

چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ چندن نگر پہونچے۔ آج پورے اٹھارہ برس بعد وہ یہاں آئے تھے۔ ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آنے لگی۔ گھر کا پتہ

پوچھتے پوچھتے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اتنے میں پاس سے گذرتے ہوئے ایک بوڑھے آدمی نے انہیں دیکھا اور پھر کہہ اٹھا۔

ارے ...... تم ممتاز تو نہیں ـــــ"

مم ...... میں .... جی ہاں میں ممتاز ہی ہوں۔ وہ بوکھلا گئے۔

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے ـــــ" بوڑھے شخص نے اپنا جھریوں بھرا چہرہ قریب لے جا کر کہا۔

ارے ـــــ دیال کاکا، تم ہو۔ میں تو بھول ہی گیا۔ انہوں نے معذرت چاہی۔

"بھول جانا ہی تو تمہارا دھرم ہے بیٹا۔" دیال کاکا کے منھ سے الفاظ یوں نکلے جیسے پستول سے گولی۔

"کاکا میں اپنی غلطی پر نادم ہوں مگر ـــــ مگر یہ بتائیے کہ میری بیٹی شادماں کہاں ہے؟"

ممتاز احمد نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ دولت کو سمیٹنے والے ہاتھ آج آنسوؤں سے دل کی کھیتی سیراب کرتے ہوئے عقیدت سے اٹھ گئے۔

"ہونہہ ـــــ بیٹی ـــــ اس رشتے کا احساس کیسے جاگا تمہارے من میں۔"

وہ میری بھول تھی۔ آج میں جان گیا ہوں کہ میں ایک باپ ہوں۔ خدا کے لئے مجھے ان کے پاس لے چلئے۔ ممتاز احمد کی سراسیمگی بڑھتی جا رہی تھی۔ طوفان میں ہچکولے کھاتی وہ ناؤ ڈوب جاتی تو اچھا تھا۔ مگر افسوس ـــــ کنارے نے بے وفائی کی۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار، ایک جھوٹی تسلی۔

ایک مایوس امید ـــــ یہی تو رہ گیا تھا اس کے پاس ـــــ" کاکا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کاکا۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بتاؤ وہ کہاں ہے ـــــ"

ممتاز احمد قریب قریب رو پڑے۔

وہ ایسی راہ پر چل پڑے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آسکتا۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار مل گیا۔ میں نے ہی وہ خط تمہیں پوسٹ کیا تھا ایک ماہ پہلے کاش تم نے وقت کی قدر کی ہوتی۔ بس یہی ایک آخری پرچہ تھا جو اس کے ہتھیلی میں رکھا ہوا تھا لو دیکھو ـــــ" دیال کاکا نے ایک کاغذ ان کے حوالے کر دیا۔ بھیگی آنکھوں سے تحریر پڑھی جانے لگی۔

طوفان ہی گر ڈبوتا تو اتنا غم نہ ہوتا
کنارے آکے ڈوبا ہوں، کنارے بے وفا نکلے

انتظار، آس اور تسلی کے صلیب پر آخر کار میں نے پھانسی لے لی۔ میری موت اٹھارہ برس پہلے ہی ہو چکی تھی۔ میرا وجود اٹھارہ برس پہلے ختم ہو چکا تھا۔

میری ماں ـــــ آئینے کی طرح صاف، موتی کی طرح شفاف مگر زمانے نے اس کے اجلے دامن کو داغدار کیا۔ میرا رشتہ ٹوٹا۔ میری ماں کی تپسیا ختم ہو گئی۔ مجھے اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ میرا باپ بدچلنی کی وجہ سے میری ماں کو اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

کیا یہ سچ ہے ـــــ میری ماں، جس نے عزت اور وفا کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔ محض اس لئے بدکردار قرار دی گئی کہ اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا۔ دکھوں کی دلدل میں پھنسا ہوا میری ماں کا دل کانچ کے شیشے کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ہم نے سب کچھ سہہ لیا مگر اس گھناؤنے

الزام کے بعد سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ ہم اپنی مرضی سے اپنے ناکردہ گناہ کی سزا قبول کر رہے ہیں۔ ہماری موت کا کوئی ذمہ دار نہیں ——— شاید کوئی ہو بھی۔"

اس کے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ اور حقیقت بھی تو یہی تھی۔ ممتاز احمد خود فراموشی کے عالم میں اس کاغذ کو تکتے رہے۔ انہیں کب کار میں بٹھایا گیا۔ وہ کب شہر پہونچے اس کا انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔

دوسرے دن اخبار میں جلی حروف میں لکھا تھا۔

"شہر کے مشہور و معروف رئیس جناب ممتاز احمد کا اچانک انتقال وہ صبح اپنے رائیٹنگ ٹیبل پر مردہ پائے گئے۔ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق ان کی موت حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہوئی۔

انہوں نے اپنی ساری جائیداد، ملز، روپیہ، پیسہ، شہر کے یتیم خانوں اور ریسکیو ہوم کے نام لکھ دیا۔ واضح رہے کہ اس عظیم صنعت کار اور سماجی رہنما کو کوئی اولاد نہ تھی۔"

یہ بتا چارہ گر.....

دن کا اُجالا سرمئی اندھیرے میں بدلنے لگا تھا۔ سڑک پر ٹرافک کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ سبھی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف رواں تھے۔ بسوں، کاروں، آٹو رکشاؤں اور اسکوٹروں کا قافلہ تھا کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیتا۔ دینو بہت بڑی دیر سے روڈ کراس کرنے کے لئے بے چین تھا۔ بس کچھ دن ہی تو ہوئے تھے اسے شہر آئے۔ وہ بھلا کیا جانے یہاں کی ٹرافک کے اصول۔ بے چارہ سیدھا سادھا بھولا بھالا دیہاتی معصوم سا لڑکا جس کے ہونٹ ہمہ وقت متبسّم نظر آتے، پتہ نہیں وہ اپنی ذات سے مسرور تھا یا پھر زمانے کے نشیب و فراز کی ہنسی اڑاتا۔ بہر کیف مسکراہٹ اس کی شخصیت کا خاص حصہ تھی۔ غم روزگار نے گاؤں کے خاموش ماحول سے اُٹھا کر اسے شہر کی گہما گہمی کے ساگر میں ڈال دیا۔ وہ حیران و پریشان سرگرداں تلاشِ روزگار میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ رات کو کسی فٹ پاتھ یا دوکان کے سائبان میں پناہ مل جاتی مگر دن کا سارا وقت سڑکیں ناپنے میں ہی کٹتا۔ اونچی اونچی عمارتیں، کشادہ سڑکیں، آنکھوں کو چبھ جانے والی روشنیاں۔ اس ماحول میں وہ خود کو کسی طلسماتی کہانی کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔

ٹرافک سگنل کے پاس سرخ رنگ کے جلتے ہوئے بلب کو اس نے غور سے دیکھا، یہ تو رما کے ہونٹوں کی سرخی چرا لایا تھا۔ ایک پل کو

وہ اپنے گاؤں کے ماحول میں چلا گیا۔ کھنکھناتی ہنسی، پائل کی چھم چھم، چوڑیوں کے جل ترنگ وہ پنگھٹ کے قریب درخت سے ٹیک لگائے رما ہی کا تو انتظار کر رہا تھا دفعتاً کسی نے اس کی آنکھیں پیچھے سے موند لیں۔ اس نے ٹٹول کر دیکھ لیا۔

"رما ـــــ" وہ گنگنا اٹھا۔ ایک نقروی ہنسی فضا کو معطر کر گئی۔

"میں کب سے راہ تک رہا ہوں اور تو اتنی دیر بعد آئی۔"

"ہائے دیا بڑا تھک گیا تو تو۔ تجھے تو یونہی راہ دیکھنی پڑے گی میری۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"اے پگلی ـــــ بیکار کی باتیں نہ کر۔ بس اگلے بسنت کو تیرے ہاتھوں کے لئے مہندی لے کر ہی آؤں گا۔"

"اونہہ ـــــ بڑا آیا مہندی والا، جیب میں تو چار پیسے نہیں اور سپنے دیکھتا ہے بدھو۔"

وہ تو چلی گئی، مگر دینو کے دل میں جیسے پھانس چبھ گئی۔ ایک لاوا اس کے کانوں میں انڈیل دیا گیا۔

"باپو ـــــ" اس نے کھاٹ پر لیٹے بوڑھے پتا کے قریب جا کر کہا۔

"کیا بات ہے رے ـــــ" اس کا باپ اٹھ گیا۔ "بڑا گھمبیر دکھائی دے رہا ہے۔"

"سارا دن بھوکا پھرتا ہے نا روٹی کھائی نہیں اس لئے تو منہ اتر سا گیا ہے۔" ماں نے اس کے ماتھے پر آئے پسینے کو اپنے پلو سے صاف

کرتے ہوئے کہا۔

"باپو ـــــ ہم ..... ہم ..... میں" وہ جانے کیوں جھجکا ہوا رہا تھا۔

"ہاں ہاں بول دینو کیا بات ہے۔"

"باپو ـــــ میں شہر جاؤں گا۔" جیسے آتش فشاں پھوٹ پڑا۔

"ہائے رام شہر جائے گا۔ بھلا کیوں ـــــ؟" اس کی بوڑھی ماں کا دل جیسے بسمل پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔

"کیوں بیٹا ـــــ یہاں کیا کمی ہو گئی ہے گائے بھینس ہے کھیت کھلیان ہیں۔ بھلا وہاں کیا رکھا ہے۔"

"گائے بھینس، کھیت کھلیان ـــــ باپو جیون بتانے کیلئے بس اتنا ہی کافی ہے کیا ـــــ؟"

"تو اور کیا چاہیئے تجھے ـــــ ماں نے سوال کیا۔

"کل کو بیاہ ہوگا۔ وہ آئے گی تو اس کے سپنے بھی ساتھ ہوں گے میں کیسے اس کے سپنے پورے کروں گا۔ کہاں سے لاؤں گا وہ تمام چیزیں۔"

"دینو ـــــ تجھے کیا ہو گیا بیٹا۔ تو اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے سوچنے لگا ہے۔" ماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ماں ـــــ تجھے کچھ پتہ نہیں۔ آج دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور ہم ـــــ بس وہیں کے وہیں رہے۔ دودھ دوہنا، ہل چلانا اور بس ـــــ"

"بیٹا۔ پیٹ کی آگ تو روٹی ہی سے بجھتی ہے۔ اتنا تو بھگوان نے دیا ہے ہم کو۔"

"باپو۔ تم سمجھتے کیوں نہیں، ضرورت صرف پیٹ کی ہی نہیں ہوتی۔ تن کو اچھے کپڑے چاہئیے۔ آرام کے لئے نرم بستر چاہیئے۔ رہنے کے لئے بڑا سا گھر چاہیئے۔ اپنی اچھائیں پوری کرنے پیسے چاہیئے۔

"اوہ تو اب تیرے من میں آشائیں بھی جاگ اٹھی ہیں۔"

"آشا تو ہر انسان کے من میں ہوتی ہے باپو۔ میں بھی اس کا پجاری ہوں۔ بھلا کب تک اسے لوریاں دے کر سلاتا رہوں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

تو اپنا من میلا نہ کر دینو —— تو چاہے تو شہر چلا جا۔ کوئی کام دھندہ کر کے اتنا پیسہ جمع کر لے کہ تیری ساری آشائیں پوری ہو جائیں۔" اس کے باپ نے اسے تسلی دی۔

"تو سچ کہتا ہے بیٹا۔ تھوڑی سی زمین، بہ چوپائے، ہم بھلا اس سے تیری آشائیں کیسے پوری کریں گے۔" ماں کا لہجہ مایوسی میں بدل گیا۔

نہیں ماں —— ایسا نہ کہہ، اداس مت ہو، میں شہر جا کر اتنا کماؤں گا کہ تیری عمر بھر کی محنت سپھل ہو جائے گی۔ تجھے اتنا آرام دوں گا کہ تو راج کرے گی۔ باپو کو اتنا سکھ دوں گا کہ وہ اپنی جیون بھر کی بپتا کو بھول جائیں گے۔ بس تم لوگوں کا آشیرواد چاہیئے مجھے۔" اس کا سر دونوں کے چرنوں میں جھک گیا اور وہ شہر چلا آیا۔

شہر —— روشنیوں سے جگمگاتا۔ اونچی اونچی عمارتوں سے مزین، لانبی لانبی کشادہ راستوں سے آراستہ سواریوں کی ریل پیل سے پُر رونق شہر اس کے لئے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا پتہ نہیں کیوں وہ یہاں آکر اپنے گاؤں کی خاموش فضاؤں کو بھول گیا تھا۔ فٹ پاتھ

پر کھڑا کھڑا ٹرافک سگنل کی سرخ روشنی میں جب رما کے ہونٹوں کی سرخی اسے یاد آئی تو وہ ایک بار اپنے گاؤں کے ماحول میں کھو گیا۔

بڑی دیر سے کار کا ہارن بج رہا تھا۔ مسلسل ایک کے بعد ایک ہارن بجنے لگے تھے۔ ان آوازوں پر وہ چونک گیا تب اس نے دیکھا وہ لاریوں بسوں، اور کاروں کے درمیان پھنسا کھڑا تھا۔ اور ایک کانسٹبل اس کا ہاتھ تھامے ٹینک بنڈ پر روڈ کراس کروا رہا تھا۔

"جانے کہاں سے آمرتے ہیں ـــــ ؟ جنگلی ـــــ"
کانسٹبل نے غراتے ہوئے کہا۔

"میں مرا نہیں ہوں صاب۔ زندہ ہوں۔" اس نے اپنے گریبان کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میں اگر نہ تھامتا تو یقیناً مر گیا ہوتا۔ مرنے کا شوق ہے تو جا اس میں ڈوب کر اپنی جان دیدے۔" کانسٹبل نے حسین ساگر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ بغور اس جانب دیکھنے لگا، جہاں حسین ساگر کے دامن میں مہاتما بدھ کا دیو قامت مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں پہنچ گیا نظر دوڑائی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ طویل قامت مہاتما بدھ کا مجسمہ ایک بڑی سی ٹرالی پر رکھا ہوا تھا۔ بدھ کے چہرے پر پھیلی ہوئی پرسکون مسکراہٹ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی اس کی نظریں عقیدت سے جھک گئیں، اور اس نے بدھا کے پیروں پر اپنا سر جھکا دیا گویا آشیرواد کا طلب گار ہو۔

"ارے بھیا، ہٹو یہاں سے ـــــ" کسی نے اس کا شانہ ہلایا اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"ارے تو ـــــ دینو ہے نا!" اس شخص نے اس کے

چہرے پر نظر ڈالتے ہی پوچھا۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ میں ...... میں دینو ہوں۔

آپ ـــــ آپ بدری ناتھ جی ہیں نا!" دینو کو یاد آیا۔

"ہاں میں بدری ناتھ ہی ہوں ـــــ تو ـــــ تو یہاں کیسے چلا آیا، اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر۔" بدری ناتھ نے پوچھا۔

"روپیہ کمانے کے لئے ـــــ سُنا ہے شہر میں گلی کوچوں میں بھی روٹی مل جاتی ہے۔ گاؤں میں کیا رکھا ہے بھلا۔ مکئی کی روٹی، چھاچھ دودھ دہی اور بس ـــــ" دینو نے کچھ اس انداز سے منہ بنا کر کہا گویا اس کے ذائقہ سے بھی اسے نفرت ہو۔ بدری ناتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

تو تجھے آخر شہر کی کمائی کا لالچ کھینچ کر ہی لایا۔ ٹھیک ہے میں صاحب سے کہہ کر تیرے لئے یہیں کام کا انتظام کروا دیتا ہوں .... بدری ناتھ اسے لے کر کنٹراکٹر کے پاس پہنچے۔

"سر۔ یہ میرے ہی گاؤں کا لڑکا ہے۔ محنتی ہے ہمیں ہلپرس کی ضرورت ہے اسے کام پر لے سکتے ہیں۔"

"او کے۔ اگر تم اسے محنتی سمجھتے ہو تو کام سمجھا دینا۔" کنٹراکٹر نے بدری ناتھ کو ہدایت دیدی۔

"سن دینو۔ یہیں پر تجھے کام کرنا ہے۔ ہر ہفتہ اجرت ملا کریگی یومیہ ۳۰ روپے کے حساب سے تجھے دیا جائے گا۔ وہ سامنے دیکھ رہا ہے نا! ایک اونچی سی چٹان جو ساگر میں دکھائی دے رہی ہے۔"

"بس ـــــ مہاتما جی کی اس مورتی کو وہاں بٹھانا ہے۔" بدری ناتھ نے اسے کام کے بارے میں سمجھایا۔ دینو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"بدری ناتھ جی میں آپ کا بڑا ابھاری ہوں۔ آپ نے مجھ پر بڑی دیا کی ہے۔ میں جی جان سے کام کروں گا۔ یہ میرا سوبھاگیہ ہے کہ مجھے یہ پُن کا کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ آپ بڑے دیالو ہیں بدری ناتھ جی اب میں ماں اور باپو کو دکھادوں گا کہ شہر کی کمائی کیسی ہوتی ہے۔" اس کا سینہ فخر سے تن گیا وہ انگلیوں پر اپنی اجرت کا حساب کرنے لگا۔

دوسرے ہی دن وہ کام پر لگ گیا۔ کئی انجنیئرس، ٹیکنیشن کنٹراکٹرس، اور بے شمار مزدور اس ٹرالی کے کام کے لئے جٹ گئے تھے۔ مہاتما بدھ کے اس طویل قامت مجسمے کو "راک جبرالٹر" پر نصب کرنا تھا جو ایک بڑا مرحلہ تھا۔ آخر کار ۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء کو یہ مجسمہ لوہے کی بنی اُس مضبوط سو پہیوں والی ٹرالی کے ذریعہ "جبرالٹر راک" کی طرف لے جایا جانے لگا۔ مجسمے کے ساتھ انجنیئرس اور ٹیکنیشن کے علاوہ ہلپرس بھی تھے۔ دینو انہی کے ساتھ سوار تھا۔ شہر کی رونق اس سے دوبالا ہونے والی تھی۔ اس عظیم الشان مجسمے کی تیاری سے لے کر اس کے نصب کرنے تک کا ایک بڑا پراجکٹ تھا۔ جس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے انجنیئرس بھی حصہ لے رہے تھے۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء کا دن، شام ہیں ڈھلنے کے قریب آرہا تھا۔ شفق کی سرخی پھیل چکی تھی۔ ابھی کنارے سے چند گز کا فاصلہ بھی ٹرالی طے نہ کر پائی تھی کہ ایک سانحہ عظیم ٹوٹ پڑا۔ ٹرالی کے دائیں جانب وزن کی زیادتی سے مجسمہ پھسل پڑا۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹرالی الٹ گئی، جس میں سوار سارے انجنیئرس، ٹیکنیشن اور مزدور بھی پانی میں ڈوب گئے۔ چاروں طرف ہاہاکار مچ گیا۔ شام کی سرخی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی

آگ کی طرح پھیل گئی۔ حسین ساگر پر لوگوں کا اژدہام تھا۔ ڈوبنے والوں کے رشتہ داروں کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی صدائیں فضا کو دہلا رہی تھیں، عجیب ہیبت ناک منظر تھا۔ انسانی سروں کا سمندر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ تاریکی اور ہاہا کار یوں لگ رہا تھا جیسے قیامت آگئی ہو۔ کوئی سر پیٹ رہا تھا کوئی بال نوچ رہا تھا۔ کوئی سینہ کوبی کر رہا تھا۔ عجیب دلخراش منظر تھا۔ رات بھر یہی عالم رہا، صبح سویرے چند لاشیں پانی میں تیرتی دکھائی دیں۔ لاشوں کی شناخت کے بعد انھیں ورثہ کے حوالے کیا جا رہا تھا اور جو شناخت نہ ہو سکیں انھیں مردہ خانہ میں رکھوا دیا جا رہا تھا۔ بدری ناتھ کی نگاہیں دینو کو ڈھونڈ رہی تھیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دینو ہی پہلا آدمی تھا جو ٹرالی میں بڑی عقیدت کے ساتھ سوار ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ یوں جوڑے تھے گویا یہ کہنا چاہتا ہو، بس اب آگیا دیکھئے ______ مگر دینو کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ دو دن اور گذر گئے ساگر کے پانی میں خون کی سرخی چھلکنے لگی تھی۔ ماحول بڑا بھیانک تھا، تعفّن اور بدبو کی وجہ سے وہاں ٹھیرنا بھی دشوار تھا۔ رات اور دن لاشوں کی تلاش کا کام جاری تھا۔ ماہر غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، ساری کی ساری لاشیں اس قدر مسخ ہو چکی تھیں کہ ان کا پہچاننا بھی مشکل تھا، بعض لاشیں تو ایسی بھی تھیں جن کے اعضا مچھلیوں نے کھا لئے تھے۔ حکومت نے مہلوکین کے ورثا کو دس ہزار روپے ایکس گریشیا دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ سارا شہر ماتم کناں تھا۔ اپنی ناک پر کپڑا رکھے بدری ناتھ دینو کو تلاش کر رہے تھے۔ چوکڑی والے آسمانی شرٹ میں ایک کچلا ہوا ہاتھ انھیں نظر آیا جس پر ہندی میں "دینو" گدوایا ہوا تھا، اگرچہ چہرہ اس قدر مسخ تھا کہ شناخت ناممکن سی تھی۔ مگر اس نام نے اپنا پتہ خود دے دیا۔ وہ

دوڑے دوڑے بڑے صاحب کے پاس پہونچے۔

"سر ـــــ دینو نامی مزدور کی لاش مل گئی ہے میں اس کے بوڑھے ماں باپ کو اس کی اطلاع کر دوں گا۔"

"اسے لاوارث لاشوں کے ساتھ نہ بھیجئے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا رومال دینو کے مسخ شدہ چہرے پر ڈال دیا اور ایک سرکاری جیپ کے ذریعہ اس کے گاؤں روانہ ہوئے۔

جیپ سے اتر کر دینو کے گھر جاتے ہوئے ان کے قدم من من کے ہوگئے۔ وہ طے کر رہے تھے کہ کس طرح اس بات کی اطلاع اس کے ضعیف اور بوڑھے والدین کو دی جائے اسی الجھن میں وہ رما سے الجھ گئے جو گاگر اٹھائے بڑے ناز سے اٹھلاتی چلی آرہی تھی۔

"رام رام صاحب جی ـــــ" انھوں نے رما کی آواز پر اپنے ہاتھ جوڑ لئے۔

"آپ ـــــ شہر سے آرہے ہیں نا۔ وہاں ـــــ دینو ملا تھا آپ سے۔" اس نے اپنے آنچل کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہا ـــــ ں ـــــ" ان کی سانس لمبی ہوگئی۔

"اس نے کوئی ..... سندیسہ بھیجا ہے ـــــ" وہ کچھ شرما کر کچھ لجا کر بولی۔

"سندیسہ ـــــ ہاں ـــــ مگر ـــــ مگر تو تو کیا لگتی ہے اس کی۔" بدری ناتھ جی بوکھلائے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"وہ ـــــ وہ تو میرا ـــــ میرا ـــــ اور پھر رما نے شرما کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ بدری ناتھ جی اس کے

قریب پہونچے۔

"تیرا نام رما ہے نا! ـــــ" اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

"ہاں ـــــ"

وہ اکثر تیرے بارے میں بتایا کرتا تھا۔ تیرا نام میں نے بہت بار سُنا ـــــ"

"سچ ـــــ" رما کی خوشی دوبالا ہو گئی۔

"رما ـــــ تو اس کی راہ دیکھ رہی ہے ـــــ"

اور نہیں تو کیا ـــــ"

یہاں آ ـــــ میرے نزدیک ـــــ" بدری ناتھ نے اسے پاس بلایا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔ انھوں نے رما کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سانولے اور تیکھے نقوش والی اس لڑکی میں بلا کی جاذبیت تھی۔ خصوصاً اس کی آنکھیں گویا جگ مگ کرتے ہیرے ـــــ یاقوتی لبوں پر ہر وقت ہنسی مچلی رہتی۔ شفاف پیشانی پر چمکتی ہوئی بندیا ـــــ دوسرے ہی پل انھوں نے اس کے ماتھے کی بندیا پونچھ ڈالی۔

اب یہ چوڑیاں بھی توڑ دے ـــــ یہی دینو کا سندیس ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے اور رما ندی کے پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگی جو مٹی ہوئی بندیا سے پرایا لگ رہا تھا۔ جیسے کسی ودھوا کا ہو ـــــ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ درختوں پر بیٹھے پرندے گھبرا کر اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔

بدری ناتھ دینو کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"کاشی رام ـــــ" ان کی آواز جیسے بیٹھ رہی تھی۔

"کون ہے ؟" بوڑھا کاشی رام اپنی لکڑی ٹیکتا۔ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ کمزور نگاہوں سے بغور تلاش کر کے پہچان لیا کہ یہ بدری ناتھ ہیں۔

"اوہ آپ ہیں صاحب جی ـــــ" آیئے کیسے کشٹ کیا ـــ آج سداما کے گھر کرشن آ گئے ـــــ" اس نے کھاٹ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اری او دینو کی ماں .... دیکھ تو کون آیا ہے۔" اس نے اپنی بیوی کو آواز لگائی۔

"کون ہے ـــــ" بڑھیا باہر نکل آئی۔

"رام رام صاحب جی۔ کیسے کرپا کی۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"دینو ـــــ کہاں ہے ـــــ" ان کا دل اپنے اس سوال پر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"کیا بتائیں صاحب جی۔ وہ تو پیسہ کمانے شہر گیا ہے۔ دو ہفتے گذر گئے کوئی چھٹی بھی نہیں آئی۔ پتہ نہیں کیسا ہے وہ ـــــ" کاشی رام کی آواز رندھ رہی تھی۔

"کتنا سمجھایا پر مانا نہیں ـــــ کہتا تھا سہر میں تو گلی کوچوں میں بھی، کچرے کے ڈھیر میں بھی روٹی مل جاتی ہے۔" اس کی ماں پلو سے آنسو پونچھتی کہہ رہی تھی۔

"میں ـــــ میں تو تم لوگوں کو شہر لے جانے آیا ہوں"۔ بدری ناتھ نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

"سہر کو بھلا ـــــ کیوں ـــــ" ؟ کاشی رام نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ـــــ رینو نے ـــــ تم لوگوں کے نام کچھ روپے جمع کروایا ہے ـــــ اور وہ ـــــ وہ بس تم ہی کو مل سکتا ہے ۔ اسے لینے کے لئے تمہارا شہر جانا ضروری ہے ۔" ایک من گھڑت کہانی انھوں نے سنا دی ۔

"دینو نے ہمارے نام ـــــ روپے جمع کروایا ہے ـــــ!"

کاشی رام نے حیرت سے سوال کیا ۔

"میں نہ کہتی تھی وہ سہر جاکر تمہارے سارے سپنے پورے کردے گا ۔ کتنا روپے ہوگا صاحب جی ۔" اس کی ماں پہلے اپنے پتی سے اور پھر بدری ناتھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی ۔

"یہی ـــــ کوئی ..... دس ہزار روپے ۔" بدری ناتھ کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی ۔

دس ہجار ـــــ" بوڑھے ماں باپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور پل بھر کے لئے گویا وہ سکتے میں آگئے ۔ بدری ناتھ چند لمحوں تک خاموش رہے ۔ پھر انھوں نے سکوت توڑا ۔

"تو چلئے ـــــ آپ لوگ ـــــ میرے ساتھ سرکاری گاڑی میں ...."

"ہاں ہاں کیوں نہیں ـــــ کیوں جی ۔ دیکھ لیا میرا بیٹا کہتا تھا نا کہ میں سہر جاکر اتنا روپیہ کماؤں گا کہ ماں راج کرے گی اور باپو اپنی ساری بپتا بھول جائیں گے ۔ آخر اس نے اپنی بات پوری کر دکھائی ۔ ـــــ"

دینو کی ماں خوشی خوشی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ "بس میں تو ابھی آئی ـــــ" اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئی ۔

"دس ہجار کی رقم دینو نے بھلا اتنی جلدی کیسے کمائی صاحب۔"
بوڑھے کاشی رام کے من میں وسوسے جاگنے لگے۔

"بھلا کیا کام کرتا ہے وہ ــــــ "کچھ دیر رک کر اُس نے پھر کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پیسہ بے ایمانی سے جمع کر رہا ہے ــــ"

نا نا ــــ ایسا نہ کہو ــــــ" بدری ناتھ اس الزام پر لرز کر رہ گئے۔

"تو پھر بتلائیے نا ! اتنی رقم اسے کیسے ملی ..." کاشی رام کے من کو چین نہ ملا۔

"وہ ــــ شہر جانے پر ــــــ معلوم ہو گا ــــــ"

اتنا کہہ کر بدری ناتھ جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

ویسے میرا دینو اچھا تو ہے نا ــــ !" کاشی رام کا دل جانے کیوں بوجھل ہو رہا تھا۔

"اچھا ہی ہو گا۔ دیکھو ہمارے بلانے کے لئے سرکاری موٹر بھیجی ہے"
دینو کی ماں اپنی بغل میں ایک گٹھری دبائے چلی آئی۔

"ارے تو تو بس ــــــ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔"

"تمہیں کیا پتہ ــــــ دینو کے باپو ــــــ میری تو آنکھیں ترس گئیں اسے دیکھنے۔" ممتا کے اس طوفان میں بدری ناتھ تنکے کی طرح بہہ گئے۔

"اچھا اچھا اب چل اور جی بھر کے دیکھ لے اپنے لاڈلے کو ـــ"
کاشی رام جیپ میں سوار ہوتا ہوا کہہ رہا تھا۔ جیپ شہر کے راستے چل پڑی۔
چار بجتے بجتے یہ لوگ شہر پہونچ گئے۔ جیپ سیدھے عثمانیہ

ہسپتال پر رک گئی ۔ تینوں اتر پڑے ۔ دینو کی ماں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
" اتنے بڑے محل میں رہتا ہے دینو ـــــ دیکھا دینو کے باپو۔
بھگوان کی کیسی لیلا ہے۔" اس کی ماں ہسپتال کی عمارت کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

" رام کی لیلا رام ہی جانے ـــــ" کاشی رام بدری ناتھ کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سیدھے مارچری (مردہ خانہ) پہونچے۔ لوگوں کی آہ وبکا، درد انگیز چیخوں سے ماحول لرز رہا تھا۔ ایک پل کے لئے بوڑھے ماں باپ گھبرا گئے۔

" یہ ...... یہ کہاں لے آئے ہو صاحب جی ـــــ"
کاشی رام نے پوچھا۔

" یہ ...... یہ مردہ خانہ ہے" ان کی آواز نیم مردہ ہو چکی تھی۔
" مگر مگر آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں۔ ـــــ"
بوڑھی ماں کے لب لرزنے لگے۔

" تمہارا دینو ـــــ یہیں ملے گا ـــــ" بدری ناتھ نے بم داغ دیا۔ بوڑھی ماں کے ہاتھ سے کپڑوں کی گٹھری چھوٹ گیا اور ضعیف باپ کے ہاتھوں سے اس کی لاٹھی۔

" یہ ـــــ یہ کیا کہہ رہے ہو صاحب ـــــ" بوڑھے کاشی رام نے دھاڑا۔

" ہاں۔ کاشی رام تمہارا دینو یہیں ہے ـــــ دو دن پہلے مہاتما بدھ کی جس ٹرالی پر وہ کام کر رہا تھا وہ پانی میں ڈوب گئی۔ جس میں سینکڑوں مزدور دب کر اور ڈوب کر مر گئے۔ دینو بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ" اس کی بوڑھی ماں کی فلک شگاف چیخیں عثمانیہ ہسپتال کے بلند و بالا میناروں سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔

"ـــــ اس کی لاش کی پہچان کر لو سرکار تمہیں دس ہزار روپے دے دیگی۔ اس حادثہ میں مرنے والے ہر مزدور کے ورثا کو یہ رقم دی جا رہی ہے۔" بدری ناتھ نے پوری وضاحت کر دی۔

"دینو کی لاش کے دام ـــــ دس ہجار ـــــ" کاشی رام منھ ہی منھ میں بڑبڑایا۔

"نہیں کاشی رام ـــــ ایسی بات نہیں۔ حادثے میں مرنے والوں کے رشتہ داروں کو سرکار کی طرف سے ایکس گریشیا دیا جاتا ہے۔ دینو بھی چونکہ ایک حادثے میں گذر چکا ہے۔ اس لئے اس کے ماں باپ کو یہ رقم امداد کے طور پر دی جا رہی ہے۔ بس لاش کی شناخت کر لو اور رقم لے لو"

"چلو ـــــ مجھے دینو کے پاس لے چلو ـــــ" بوڑھی ماں گڑگڑا رہی تھی۔

"چپ ہو جا ـــــ تو یہاں دینو کی لاش لینے آئی ہے ـــــ اری پگلی وہ تو زندہ ہے۔"

"دینو کے باپو ـــــ تم ـــــ تم سٹھیا گئے ہو۔ مجھے جانے دو، میں ایک نظر اپنے دینو کو دیکھ لوں۔" وہ جیسے خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"نہیں ـــــ ہمارا دینو سہر آیا ہی نہیں تھا۔ وہ تو وہیں ہے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے۔"

"شاید اس اچانک صدمے نے اسے پاگل کر دیا ہے ـــــ"

_____ بدری ناتھ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھے۔

"نہیں صاحب _____ میں پاگل نہیں ہوں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بوڑھے ماں باپ کو دس ہجار روپوں کی یہ چادر جیون کا سارا سکھ دے دیگی۔ نہیں صاحب نہیں _____ میرے بڑھاپے کی لاٹھی دینا کا بازو تھا۔ میرے جیون کا سکھ تو دینو کی آنکھوں میں تھا۔ ان روپوں میں نہیں _____ میں میں آپ سے بنتی کرتا ہوں، آپ یہ روپیہ کسی کو دے کر میرا دینو مجھے واپس کر دیں۔ ایک بوڑھے باپ کی آس کو لوٹا دیں۔ _____ اور اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے تو پھٹکار ہے ہم پر جو اس کی موت کے نام پر یہ پیسہ ہم لیں۔ چل دینو کی ماں۔" کاشی رام نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مگر _____ مگر میرے دینو کو دیکھ تو لینے دو مجھے _____"

وہ التجا کر رہی تھی۔

"کہہ دیا نا میں نے _____ ہمارا دینو مرا نہیں وہ زندہ ہے۔ بھگوان نہ کرے ہم اس کی لاش کو دیکھیں اور پیسہ کمائیں۔ چل پگلی وہ تو وہیں کھیتوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔" وہ اسے گھسیٹتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل گیا

دوسرے دن حسین ساگر کی سطح آب پر دو بوڑھی لاشیں تیر رہی تھیں۔ یہ وہ مزدور تو نہیں تھے _____ پھر بھلا ان کے لئے کون ایکس گریشیا دے گا _____؟ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی کھلی ہوئی آنکھوں میں ایک شکایت تھی۔ آسمان کو تکتی ہوئی ان کی بے نور آنکھیں پوچھ رہی تھیں

_____ یہ بتا چارہ گر _____ ہمارا قصور کیا تھا _____!!

تلاش میں ہے سحر......

"اندھیرے میں کیوں کھڑی ہو، بتی تو جلادو۔" بوا نے کمرے میں پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر کہا۔

"دل کے اندھیرے بتی جلانے سے دور نہیں ہوتے بوا۔"

ندا کے لہجے میں صدیوں کا دکھ سمٹ آیا۔ ایک ٹھنڈی سانس بوا کے لبوں سے نکل گئی۔ اور تبھی شکیب اندر داخل ہوا۔

"ہلو ندا کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں۔ آپ کب آئے"، ندا نے سوال کیا۔

"میں گیا ہی کہاں تھا جو آؤں، کاش! تم نے مڑ کر کبھی دیکھا ہوتا" شکیب کا لہجہ اداس اداس تھا۔

"شکیب ایک بات بتاؤ، تمہاری اس جستجو کا حل کیا ہے" اس نے پوچھا۔

"تمہارے چہرے پر آنے والے کل کے سورج کی کرنیں تلاش کرنا"

"خوب۔ اماوس کی رات سے چاندنی مانگتے ہو۔ یاد رکھو ڈوبتی شام، ڈولتی نیا، شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ، آخری پہر کا زرد چاند اور دار کا ملزم جھوٹی تسلیوں سے زندگی نہیں پاتے"۔ ندا نے کہا۔

"لیکن پھر بھی امید وقت کا سب سے بڑا سہارا ہے"۔
شکیب کے لہجے میں عزم کی جھلک تھی۔
"میں امید و نا امیدی، یاس اور آس کے دور سے گذر چکی ہوں مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔" ندا کا لہجہ تلخ تھا۔
"مگر مجھے چاہیئے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا، آج بھی کہتا ہوں اور کل بھی کہوں گا۔" شکیب اٹھ کھڑا ہوا۔ شکیب کے جانے کے بعد بوا چلی آئی۔
"بیٹا کب تک اس غریب کا امتحان لوگے۔ اس کے انتظار کے راستے میں کیوں کانٹے بچھا رہی ہو۔"
"نہیں بوا۔ اب میری زندگی میں رکھا کیا ہے —— چند ٹوٹی پھوٹی سانسیں اور بس —— میں کسی کو سکھ نہ دے سکی۔ معصوم بچپن میں ماں کا سہارا کھو گیا۔ ہوش سنبھالا تو بابا کے لئے مصیبت بن گئی۔ کتنی آس، کتنی امنگوں اور کتنے آرزوؤں کے گھروندے سجائے تھے میں نے۔ کتنی چاہت کتنے ارمانوں سے ڈولی میں بٹھایا تھا انھوں نے۔ اپنی محنت اور عزت اور خاندانی وقار کا واسطہ دے کر فرحان کو میرا شریک سفر بنا دیا۔ شکیب لٹے ہوئے مسافر کی طرح بابا کا انکار سن کر لوٹ گیا۔ میرا وجود شہر خموشاں بن گیا۔ جس میں میرا احساس دفن ہو کر رہ گیا۔ میری زندگی کی بنیاد ایک ایسے الاؤ پر رکھ دی گئی جہاں میں قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔ وہ شادی سودا بازی سے کم نہ تھی۔ آئے دن کی فرمائش بابا کا بڑھتا ہوا قرض۔ فرحان کی بے اعتنائی۔ ان کے والدین کا ظلم گویا جہیز کا یہ ناگ میرے جسم کے ہر حصے کو ڈس رہا تھا —— سیتا کی سچائی

مریم کی پاکیزگی، زلیخا کی چاہ، رادھا کی وفا، میرا کی بھگتی، لیلیٰ کا پیار، سب کچھ اسی جہیز کی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ لڑکی کے گن کیا ہیں۔ سب دھن کے رسیا ہیں۔ عورت کی وفا کو زر، حیا کو زیور، خدمت کو دولت، قربانی کو سرمایہ سمجھنے والا کون رہا۔ نکاح کے چار لفظوں، اگنی کے سات پھیروں کے تقدس کو کچل دیا گیا۔ سچ! کیسے دکھ اٹھائے ہیں میں نے، کتنے ستم سہے۔ میرے جسم کے داغدار حصے انصاف طلب کرتے ہیں بوا" اس نے اپنی باہیں بوا کے آگے پھیلا دیں۔ گورے گورے جسم پر آبلوں کے گہرے گہرے داغ تھے۔ بوا کی آنکھیں رِستا ہوا ناسور بن گئیں۔

"کبھی کسی سمندر کا سکوت کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے"
اگلے دن شکیب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ارے آپ ——" وہ خیالوں کے جھرمٹ سے باہر نکل آئی۔

"ایک سوال کروں جواب دو گی ندا۔"

"کہیے ——"

"خزاں کے بعد بہار، ہر شب کے بعد سویرا، ہر آنسو کے بعد مسکان، ہر دکھ کے بعد سکھ۔ زندگی کے ان دو پہلوؤں سے تمہیں انکار تو نہیں ہے نا۔"

"نہیں۔ لیکن تم شاید یہ بھول گئے ہو کہ صحرا کو خزاں یا بہار سے مطلب نہیں۔ پتھر کے مجسمے آنسو اور مسکان کے فرق سے عاری ہوتے ہیں۔ کانٹے کھلنے اور مرجھانے کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں ہے نا، ندا

نے ایک گہری نگاہ شکیب پر ڈالی۔

"تم ہارنا نہیں جانتی ہو ندا۔"

"نہیں شکیب میں نے تو زندگی کی اتنی بڑی بازی ہار دی ہے کہ اب کسی مقابلے میں حصہ لینے کی طاقت نہیں۔"

"آہنی ارادے تیز رو ہواؤں کا رخ بدل دیتے ہیں۔ اور میں وہی عزم لئے تمہارے در دل پر دستک دیتے چلا آ رہا ہوں۔ اقرار کے سکے ڈال کر مجھ غریب کی کشکول بھر دو۔" شکیب کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

"شکیب! خیرات کی سانسیں دیر پا نہیں ہوتی۔ مانگی ہوئی خوشیاں دل کو سکون نہیں دے سکتیں۔ میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ میں ایک کٹی ہوئی پتنگ ہوں۔ ایک ایسا آئینہ ہوں جس پر وقت کی گرد جم چکی ہے۔ ایک ایسا پھول ہوں جو شاخ سے کٹ کر گر چکا ہے۔" ندا کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

پلیز ندا۔ میرے صنم خانے پر پتھر نہ برساؤ، تم نہیں جانتیں میں نے بڑے جتن، بڑے آرزوؤں سے اسے سجا رکھا ہے۔" شکیب کی آواز رندھ گئی۔

"میں تمہیں کچھ نہیں دے سکوں گی شکیب، ظالموں نے ماں بننے کا حق بھی مجھ سے چھین لیا۔ بابا تو صرف طلاق کی نوٹس دیکھ کر قید حیات سے آزاد ہو گئے، اور میں جنم جنم کی سزا بھگتنے کے لئے زندہ رہ گئی۔ نہیں شکیب میں تمہاری زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہو گئی

"ندا میرے انتظار کا پیمانہ کبھی چھلک نہ پائے گا۔" وہ

واپس چلا گیا۔

"بوآ۔ بولو میں کیا کروں ——" وہ بوآ کی گود میں گر پڑی۔ اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ بوآ میں شکیب کے قابل نہیں ہیں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ مجھے یہاں سے لے چلو، میں اس کی زندگی سے بہت دور جانا چاہتی ہوں۔ جہاں وہ میرے سایہ کو بھی نہ چھو سکے۔"

کہاں جاؤ گی میری بچی ——" بوآ بے تاب سی ہو گئی۔

"اس شہر سے دور بہت دور جہاں نہ ماضی کی یادیں ہوں گی نہ شکیب کا اصرار" اور وہ ایک مضبوط ارادے کے ساتھ خود کو تیار کر بیٹھی۔ بوآ کے جھریوں بھرے چہرے پر موت کے سائے لرزنے لگے۔

صبح کی اولین ساعتوں میں جب وہ اپنا اثاثہ سمیٹے گھر سے نکلنے کو تھی کہ شکیب چلا آیا۔

"ایسی بے مروتی تو دشمن بھی نہیں کرتے۔" اس نے ندا کا جائزہ لے کر کہا۔

"شکیب! خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو، میرا یہ فیصلہ یقیناً ہم سب کے لئے بہتری کا باعث ہوگا۔ تم ڈاکٹر ہو۔ ملک اور قوم کا سرمایہ والدین کی آرزوؤں کا ثمر۔ جاؤ ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرو۔"

"بے شک میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ موت کو زندگی سے بدلنا میرا مقصد ہے اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ سماج کے جس زخم سے تم گھائل ہو میں اسی کے لئے مرہم لایا ہوں۔"

"لیکن میں تو ایک ایسا درخت ہوں جس پر نہ پھول ہی کھلے

ہیں اور نہ کوئی پتے ہی اُگے ہیں۔ ایسے درخت کے سایہ میں تمہیں کیسے پناہ ملے گی۔ طلاق کی بدنام مہر میرے نام پر لگ چکی ہو تم اپنے اجلے دامن کو اس سے داغدار نہ بناؤ۔ تم اپنے والدین کی خوشیوں کو میرے لئے پامال نہیں کر سکتے۔ نہ جانے مجھ جیسی کتنی ابھاگنیں ہوں گی جو اس لعنت کا شکار ہو کر یا تو خودکشی کر چکی ہوں گی، یا کسی کوٹھے کی زینت بنی ہو گی یا پھر کسی زندہ لاش کی طرح...... جی رہی ہوں گی۔ کیا انھیں کوئی ایسا شکیبؔ مل سکتا ہے ——"

"کیوں نہیں۔ اگر شرافت، انسانیت اور اخلاقی قدریں باقی ہوں تو ہر گھر میں ایک شکیبؔ ضرور پیدا ہو گا، جو عورت کو بیوی کے روپ میں قبول کرے گا نہ کہ اسے کھنکھتے سکّوں کی تجوری سمجھے گا۔"

یہ شکیبؔ کے بابا کی آواز تھی۔ وہ چونک پڑی۔ کار سے اترتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔

"مجھے فخر ہے کہ میں شکیبؔ کا باپ ہوں۔ لڑکی تو خود ایک دولت ہے اسے دولت سے کیا تولا جائے یہ سماج اور اس کے رواج ہمارے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ چاہے تو ہم اسے کھنکتے سکوں کا ساز دیں یا معصوم مسکراہٹ کے پھول۔ تم شکیبؔ کی زندگی میں شریک ہو کر اسے خوشی اور ہمیں راحت دو گی۔ میں تم سے تمہیں کو مانگنے آیا ہوں۔" شکیبؔ کے بابا نے ہاتھ پھیلا دیئے اور وہ ان کے قدموں میں جھک گئی۔ ہوا کی پیشانی پر خوشیوں کے چاند جگمگانے لگے۔ نیا سورج اپنی روشن کرنیں سر پر سجائے دھیرے دھیرے افق سے نکل رہا تھا۔ ندؔا کی زندگی کے اندھیرے مٹ چکے تھے اور سحر اسے تلاش کر رہی تھی۔

خون پھر خون ہے.....

آج کرفیو کا ساتواں دن تھا۔ ماحول سوگوار، سڑکیں خاموش، گلیاں سونی، راستے بیکس۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بیوہ کی اداس مانگ اور ننگی کلائیاں زبان خاموشی سے تقدیر کا شکوہ کر رہی ہوں۔

ایمرجنسی کی وجہ سے میں پچھلے تین دن سے گھر نہ جا پائی تھی، رات اور دن عثمانیہ ہسپتال کی casualty میں ہی گذر جاتے۔ حادثات، پیہم حادثات ان ہی سے تو نبٹ رہی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پتہ نہیں کیوں مجھے اپنے پیشے سے یک بیک نفرت سی ہوگئی۔ بس موت کا بیدرد کھیل دیکھنا ہی تو رہ گیا اس میں۔ مشکل سے دو ماہ ہی تو گذرے تھے مجھے ہسپتال آئے پچھلے سات دن سے زخموں کی پیوندکاری کرتے کرتے جیسے ہمارے ہاتھ خود زخمی ہوگئے۔ بہتے ہوئے خون کو دیکھتے دیکھتے میں شام کی سرخی کو بھول بیٹھی ایک ہی تو رنگ ٹھہر گیا تھا، میری نگاہ میں سمٹ کر۔ سرخ سرخ رنگ جو کبھی عثمانیہ ہسپتال کی عمارت کے اوپر نظر آتا اور کبھی موسیٰ ندی کے بہتے پانی میں۔

انسانیت اپنے ریشمی لبادے کو تار تار کرکے عریاں رقص کر رہی تھی۔ بربریت سینہ تانے اپنی فتح پر نازاں تھی۔ فرقہ پرستی کا ناگ اپنا پھن پھیلائے ڈسنے کا منتظر تھا۔ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ خلوص و محبت

کی نبض تھم گئی تھی۔ ہم آہنگی اور باہمی ربط کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ گنگا جمنی تہذیب کی کشتی نفرت کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

ہم معالج ضرور تھے مگر مسیحا نہیں۔ زخموں کا مداوا تو کر سکتے تھے لیکن موت کو زندگی سے بدل نہیں سکتے تھے۔ رات اور دن کی تھکن سے طبیعت مضمحل سی ہو گئی۔ نیند نے بھی بے وفائی کر لی تھی۔ وقت گذارنے کے لئے اخبار ہی ایک ذریعہ تھا جو قتل، چاقو زنی اور آتشزنی کی سرخیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ابھی ایک صفحہ بھی الٹنے نہ پائی کہ مجھے بلاوا آگیا۔

رات کا شاید ایک بجا ہوگا۔ وقت کا احساس تو ختم ہی ہو گیا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں گردش تو کر رہی تھیں۔ مگر صبح اور شام جیسے تھم سے گئے تھے۔ چیخ و پکار، آہ وزاری، کراہ ــــــ بس یہی صدائیں ہم سُن رہے تھے۔ ان آوازوں سے کان آشنا ہونے کے باوجود دل فولاد کا نہ بن سکا تھا۔ میں ڈوبتے دل لیکن تیز قدموں سے تھیٹر کی طرف بڑھی۔

اسٹریچر پر سترہ اٹھارہ سال کی ایک معصوم لڑکی بے ہوش پڑی تھی، جس کے پہلو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سیتا کی سچائی اور مریم کی پاکیزگی کا نور پھیلا ہوا تھا اور بھی بہت سے گھائل کراہ رہے تھے۔ ایک پل کیلئے یوں لگا جیسے میں کسی مسلخ میں آگئی ہوں۔ تبھی ایک نوجوان نے میرے ہاتھ تھام لئے

"ڈاکٹر ــــــ پلیز ــــــ اسے بچا لیجئے۔ اسے کسی طرح بچا لیجئے"

"گھبراؤ نہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے۔ ــــــ خدا پر ــــــ بھگوان پر ــــــ میرا مطلب ہے ہمت سے کام لو۔" جانے کیوں میں اسے کسی کا واسطہ نہ دے سکی۔ نہ خدا کا نہ بھگوان کا ــــــ کیا پتہ وہ کون ہے؟ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ ملتجی نگاہوں میں میلے آنسو اس کے

شفاف دل کا پتہ دے رہے تھے۔

"اسے کسی طرح بچالو ڈاکٹر۔" وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"یہ تمہاری ____" میں رک گئی۔

"میری بہن ہے ڈاکٹر ____" اس نے بہ مشکل تمام کہا۔

"اوہ ____" میں اندر چلی گئی۔ زخم گہرا تھا۔ ٹانکے تو میں دیدیئے مگر خون کثرت سے بہہ جانے کی وجہ سے اس کی نبض دھیمی ہو رہی تھی۔ ہاسپٹل میں گلوکوس اور خون کی بوتلوں کا اسٹاک بھی ختم ہو چکا تھا اور جو بچی تھیں وہ اس کے گروپ کی نہیں تھیں۔ میں سوچ میں ڈوب گئی۔ ہنگامی حالات، ایمرجنسی کیا کریں اور پھر اس کا بلڈ گروپ ملنا بھی دشوار ہی تھا۔ میں نے حقیقت سے اس کے بھائی کو آگاہ کیا۔

"نہیں ڈاکٹر ایسا مت کہیئے۔ کچھ تو کیجئے۔ میرا بلڈ ٹسٹ کیجئے شاید ..... شاید یہ کام آجائے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔ میں اس کے چہرے کی اضطرابی کو دیکھ رہی تھی۔ خود اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اپنی بہن کے لئے اس کے دل میں تڑپ کا جذبہ دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آؤ تمہارا بلڈ ٹسٹ کریں شاید یہ کام آجائے" یہ کہہ کر میں اُسے اپنے ساتھ لیب کی طرف لے جانے لگی، تبھی کسی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"نہیں دیپک ____ تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اپنے دشمن کو خون دے رہا ہے۔" ایک پنڈت جی نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

"ماما ____ چھوڑ دو مجھے۔ نجمہ خطرے میں ہے مجھے جانے دو"

دیپک نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"بھول گیا اپنی بہن کی لاش کو جو جھلس کر ان ظالموں کے اتیاچار کا پرچار کر رہی تھی۔ آج تو انہی دشمنوں کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال رہا ہے۔"

پنڈت جی نے اس کے دونوں شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

"ماما ـــــــ تم صرف نفرت اور بدلے کے دھوئیں میں گھیرے ہوئے ہو۔ تمہیں اچھا اور برا کچھ بھی سوجھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں تو آشا کی چتا میں وہی چنگاری ڈھونڈ رہا ہوں۔ جو امن اور شانتی کی جیوتی جلا سکے۔

"آشا کی چتا کی راکھ تو ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی اور تو ان دشمنوں کا سہارا بن رہا ہے۔"

"دشمن ـــــــ کون دشمن۔ کس کا دشمن ـــــــ ماما ـــــــ تم کچھ نہیں جانتے۔ تم نے تو صرف یہی سنا ہے کہ۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھر کو آگ لگا دی، اسے لوٹ لیا۔ مگر شاید تمہیں اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ میری آشا کی آخری سانس تک رکھشا کرنے والا کوئی اور نہیں اشرف تھا۔ نجمہ کا بھائی جس نے چاقو کے کئی وار اپنے سینے پر لے لئے اور اپنی جان آشا کو سوغات میں دیدی۔ آشا کو جلانے والے، اشرف کو مارنے والے، میرے گھر کو لوٹنے والے نہ مسلمان تھے نہ ہندو بلکہ یہ وہ درندے ہیں جن کا مذہب ظلم، جن کا ایمان فساد، جن کی پوجا قتل، جن کی عبادت لوٹ مار ہے۔ جو چند سکوں کے عوض انسانیت کو بیچ دیتے ہیں۔

ماما ـــــــ ارتھی آشا کی اٹھی ہے تو جنازہ اشرف کا بھی اٹھا ہے۔ یہ موت آشا اور اشرف کی نہیں۔ اہنسا کی موت ہے، امن کا قتل ہے اشرف کے احسان کا قرض میرے کاندھوں پر ہے ماما۔ یہی تو وقت ہے کہ میں

اسے ادا کر سکوں۔" دیپک کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب ——" اس نے مجھے پکارا۔ میں۔ جو جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس کی آواز پر چونک پڑی۔ عجیب اتفاق تھا کہ بلڈ گروپ بالکل وہی نکلا۔ میں اس سچائی پر بوکھلا کر رہ گئی۔ اسے لے کر وارڈ میں آگئی ایک بیڈ پر دیپک کو لٹا دیا گیا اور اس کا سرخ خون سفید بوتل میں جمع ہونے لگا۔ میں سیرنج لے کر نجمہ کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ عین اسی وقت ایک مولوی صاحب اندر داخل ہوئے

"استغفر اللہ۔ یہ کام نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ ان ظالموں نے ہمارے گھر کے چراغ کو تو گل کر ہی دیا۔ اب اس معصوم پیکر کو اس خون سے ناپاک نہ ہونے دیجئے۔"

"رحیم چاچا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ آپ اس وقت جذبات سے کام نہ لیجئے۔ یہ نجمہ کی زندگی کا سوال ہے۔" دیپک نے لیٹے ہوئے ہی کہا۔

"نہیں۔ میں یہ گناہ نہیں کرنے دوں گا۔" مولوی صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"یہاں کون اپنا دھرم بھرشٹ کرنا چاہتا ہے۔" پنڈت جی بھی دیپک کے قریب آگئے۔

"خدا محفوظ رکھے تم جیسے مفسدوں سے۔" مولوی صاحب غرائے۔

"بھگوان بچائے تم جیسے راکھشسوں سے۔" پنڈت جی بھی دھاڑے

"پلیز اسٹاپ اٹ۔" میں نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو ——"

ایک بے بس زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے۔ اس کے لئے

ہر لمحہ بھاری ہے اور آپ لوگ ہسپتال میں بھی مذہب کے نام پر فساد کرنے تیار ہو گئے۔ یہاں سبھی زخمی ہیں، سبھی کراہ رہے ہیں۔ انہیں درد کا درماں چاہیئے، زخموں کا مرہم چاہیئے۔ اذیت سے راحت چاہیئے۔ انہیں زندگی چاہیئے زندگی ——— " اتنا کہہ کر میں اپنے فرض کو نبھانے لگی۔ نجمہ کے جسم میں سوئی پیوست ہو گئی۔ اور قطرہ قطرہ خون اس کی رگوں میں آنے لگا

"ڈاکٹر صاحبہ۔ میرے لئے یہ گناہ ہے کہ نجمہ کی رگوں میں دیپک کا خون دوڑے۔" مولوی صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میرے لئے یہ مہا پاپ ہے کہ دیپک نجمہ کے لئے خون دان کرے۔" پنڈت جی بھی جوش میں ڈوب گئے۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔

"کس گناہ اور کس ثواب کی بات کر رہے ہیں آپ پنڈت جی؟"

آیئے میرے ساتھ ———"

میں نے دونوں کا ہاتھ تھاما اور سیدھے بلڈ بنک کی طرف بڑھی شیلف کھول دیا۔ ایک ہی قطار میں رکھی خون کی بوتلیں اپنی یکسانیت کا احساس دلا رہی تھیں۔

"بتایئے قبلہ! ان بوتلوں میں بھرا ہوا کونسا خون مسلمان کا ہے اور کونسا ہندو کا، کونسا سکھ کا ہے اور کونسا پارسی کا۔ سمجھایئے مہاراج۔ کس خون میں پاپ کا رنگ ہے اور کس میں پُن کا۔ کونسا آشا کا ہے اور کونسا نجمہ کا"

اس سوال پر دونوں کی نظریں بوتلوں کو ٹٹولنے لگیں تاکہ اس فرق کو پالیں۔ لیکن نہ مذہب کی تلاش ہو سکی اور نہ رنگ و نسل کی۔ وہاں تو صرف ایک ہی رنگ تھا۔ خون کا سرخ سرخ ——— ایک لمحہ کے لئے دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اور نہ جانے کیوں جھک گئیں۔

"کون سے مذہب نے آپ کو خون کا فرق دکھایا ہے۔ کن مقدس کتابوں نے خون کے الگ الگ رنگ دکھائے ہیں۔ خون تو خون ہے صاحب چاہے وہ ہندو کا ہو یا مسلمان کا۔ اس کے رنگ میں ایک اٹوٹ سچائی ہے۔ وعدوں کی آبرو رکھنے کے لئے یہ ماتھے کا تلک بن جاتا ہے اور وطن کی راہ میں سر کٹا کر جب بہتا تو اسے شہید کا مرتبہ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب انسانیت سے اپنا ناطہ نہیں توڑ سکتا۔ مذہب تو ایک ایسی طاقت ہے جو مثبت ارادوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ شعور سے لاشعور تک کی منزلیں طے کرواتی ہے۔ اور روح کی تسکین کا ذریعہ ہے۔"

"مگر آج اسی کے نام پر قتل و خون اور غارت گری کا بازار گرم ہے۔ آپ لوگ ماضی کی روایتوں کے علم بردار ہیں۔ ماضی نے تو ہمیں اعلیٰ اقدار عطا کئے ہیں۔ وہی آپ کی پونجی ہے۔ وہی آپ کا سرمایہ اور وہی آپ کا ترکہ ہے۔ نئی نسل یہی ورثہ آپ سے لے گی۔

ہر ختم ہونے والا دور اپنے پیچھے ایسا نشان چھوڑ جاتا ہے کہ آنے والی نسلیں ان نقوش پر اپنے قدم جما لیتی ہیں۔ ڈوبتا ہوا سورج ہمیشہ اجالوں کا پیغام دے جاتا ہے۔"

تبھی نرس نے آکر اطلاع دی کہ نجمہ ہوش میں آ رہی ہے۔

میں وارڈ کی طرف بڑھی۔ نجمہ کے چہرے پر نئی صبح کی چمک پھیل رہی تھی یہ اس تازہ خون سے پیدا ہوئی تھی۔ جو دیپک کے جسم سے اس کے جسم میں آ رہا تھا۔ جیسے کوئی مرجھایا ہوا پودا پانی کی پھوار سے کھلنے لگا ہو۔

پنڈت جی اور مولوی صاحب بھی اندر آ چکے تھے۔

اس کی پلیٹ سے کباب لے کر چلتا بنتا۔ وہ بس ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ جانے کیوں وہ اسے چھیڑتا اور ستاتا اور کبھی کبھی تو رُلا بھی دیتا۔ اور جب وہ رونے لگتی تو اپنے رومال میں اس کے آنسو جذب کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ گھر کا کوئی فرد اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتا، صرف وہی تھی جو اس سے بیزار تھی۔

"امی مجھے صبیح سے نفرت سی ہو گئی ہے" آخر کار ایک دن اس نے امی سے کہہ دیا، نہ جانے کیا جادو ٹونا کر دیا ہے اس نے جو آپ سب اس کے گن گاتے ہیں۔"

"اور ایک تو ہی ہے جو اس کی دشمن ہے۔ وہ تو بچوں میں بچہ، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھا ہے۔ سب کو ہنسانا، سب کی خدمت کرنا۔ سب کے کام آنا یہی تو اس کی زندگی ہے۔" امی قصیدے پڑھنے لگیں اور وہ اُن کی بات ادھوری چھوڑ کر چلی جاتی گویا اس کی سرحدوں سے پرے نکل گئی ہو۔

اس نے سوچا کہ وہ آیا تو تھا ایک کرایہ دار کی حیثیت سے مگر بن بیٹھا گھر کا مکین۔ کوئی کام اس کے بِنا نہ ہوتا۔ نہ سُکھ کا نہ دکھ کا، ہر ایک کے لبوں پر ایک ہی نام ہوتا۔ صبیح ..... صبیح ..... صبیح ... یہ صبیح نہ ہوا۔ ہر تالے کی چابی بن گیا۔ وہ جھنجھلا جاتی۔

بی۔ اے کا رزلٹ آچکا تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں آئی تھی اس نے اپنی سہیلیوں کو لنچ پر مدعو کیا۔

"رانی..... صبیح کو اپنی مدد کے لئے بلا لے"۔ امی نے پکار کر کہا۔

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں میں خود ہر کام کر سکتی . . . ."

اس کا جملہ ابھی مکمل بھی نہ ہوا کہ آواز آئی۔

"بندہ خدمت کے لئے حاضر ہے۔"

"اف۔ تم پھر وارد ہو گئے۔" وہ غصے سے بولی۔

"معاف کیجئے گا میں کوئی شیطان نہیں ہوں تو بندۂ بے دام ہوں۔"

بڑے ہی شائستہ انداز سے اس نے کہا۔

"شرم نہیں آتی تم کو ایسی حرکتیں کرتے ہوئے ——؟"

"شرم! محترمہ یہ تو آپ کا سرمایہ ہے بھلا اس دولت پر ہم کیسے ڈاکہ ڈالیں۔"

"مسٹر صبیح، میں ایسی بے تکلفی کو چھچھورا پن سمجھتی ہوں۔"

"اور مس رانی، میں تکلف کو دیوار سمجھتا ہوں۔"

"اپنے حدود میں رہا کیجئے۔"

"میرا حدود اربع آپ کے ذہن مبارک سے دل مقدس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سوا میں کہیں اور پھیل ہی نہیں سکتا۔"

"آپ یہاں سے دفع ہونے کا کیا لیں گے ——" اس نے پوچھا

"بتا دوں، تو سنیئے، مسکراہٹوں میں کھلی ہوئی ایک نگاہِ کرم۔ دیں گی آپ۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا، اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

روضی تم نے کبھی پتھر کی مورتیں دیکھی ہیں —— ؟ صبح کی اولین ساعتوں میں اس کی آواز آئی۔

"نہیں صبیح بھیا۔ بتائیے نا ——" روضی چہک کر بولا۔

تو آجاؤ اس نے روضی کو گود میں اٹھا لیا اور سیدھے اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"رانی تمہیں دولہن بننا اچھا لگتا ہے ——" ایک دن اس نے عجیب سا سوال کیا۔

"ہاں ہاں ہاں —— مگر تمہاری نہیں —— سمجھے" وہ جل کر بولی۔

خدا خیر کرے۔ کیا میرے نصیب بگڑے ہیں جو میں ایسی غلطی کروں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے گال تھپتھپانے لگا" ہاں، کہو ہو تو کسی بدنصیب کی تلاش کر سکتا ہوں۔

"شکریہ، یہ زحمت آپ نہ کریں تو بہتر ہے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر عید کے دوسرے ہی روز ڈاکٹر ریاض کا رشتہ رانی کیلئے آیا وہ دوڑا دوڑا اس کے پاس پہونچا۔

"رانی پہلے اپنا ہاتھ بتانا۔" اس نے اس کی گداز ہتھیلی تھام لی۔ سرخ گل بوٹے ہتھیلیوں پہ سجے تھے۔

دیکھو میں نے بتایا تھا تاکہ دولہا پیار کرنے والا ہو تو مہندی کا رنگ گہرا ہو گا۔ بے چارہ ریاض مفت میں مارا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر رانی خوابوں میں کھو گئی۔

پھر اچانک وہ بیمار ہو گئی اسے نمونیا ہو گیا، اس کا تیماردار بنا صبیح۔ رات بھر جاگنا اور دوا وقت پر دینا، دونوں ہی کام اس کے حصہ میں آئے جب وہ ٹھیک ہو گئی تو اس نے دیکھا، صبیح کی آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو گئے تھے۔

"تم نے میری بڑی خدمت کی، شکریہ۔" اس نے لفظوں کا سہارا لیا

"شکریہ —— کتنی چھوٹی سی بات کہی تم نے۔ اس لفظ کو میرا بس چلے تو نکال پھینک دوں۔ یہ جذبات کو ٹھیس پہونچانے والا اور حدوں کو

پوچھ ہی لیا۔

"جانے کون ہے کہاں سے آیا، مگر امی کے دل پر حکومت کرتا ہے۔ سنا ہے کسی گاؤں میں رہتا ہے گنوار۔ ایم کام کیا ہے بے وقوف نے۔ محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ نکما کہیں کا۔ کوئی سرکاری ملازمت نہیں۔ سارے محلے کی خدمت کرتا ہے کوئی بیمار ہو تو وہ تیمار دار۔ کسی کے گھر خوشی ہو تو وہ منتظم۔ کسی کے ہاں غم ہو تو وہ شریک غم۔ گویا محلے کے سارے کام اسی کے سپرد۔ گویا ایک بڑا سوشیل ورکر ہے۔" وہ جل کر اس کا تعارف کراتی۔

"اتنی خوبیوں والے انسان سے تم کیوں خفا ہو۔ اس کی سہیلی نے سوال کیا۔"

مجھے اس سے نفرت ہے I hate him اور اس کے باقی الفاظ کالج کی گھنٹی کی نذر ہو جاتے۔

رمضان کی عید تھی۔ ایک رات قبل وہ اپنی ہتھیلی پر مہندی سے گل بوٹے بنا رہی تھی وہ بلائے ناگہانی کی طرح آ گیا۔

"رانی ہم نے سنا ہے کہ لڑکیاں اپنے ہونے والے دولہا کے نام پر مہندی لگاتی ہیں۔ اور دیکھتی ہیں کہ اس کا رنگ کتنا گہرا ہو گا۔ اگر رنگ گہرا ہو تو سمجھو کہ دولہا بہت پیار کرے گا اور اگر ہلکا ہو تو پھر پٹائی ضرور ہو گی۔ تمہاری مہندی کا رنگ کیسا ہے۔"

"خون جیسا ـــــ" وہ گل بوٹے بناتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"خون ـــــ اف اتنا سرخ جانے کس کا ہو گا۔

"تمہارا ـــــ" وہ جل کر بولی

"سچ ـــــ" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"رانی تمہیں دولہن بننا اچھا لگتا ہے ــــــ" ایک دن اس نے

عجیب سا سوال کیا۔

"ہاں ہاں ہاں ــــــ مگر تمہاری نہیں ــــ سمجھے"

وہ جل کر بولی۔

خدا خیر کرے۔ کیا میرے نصیب بگڑے ہیں جو میں ایسی غلطی

کروں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے گال تھپتھپانے لگا" ہاں، کہو ہو تو کسی بدنصیب

کی تلاش کر سکتا ہوں۔

"شکریہ، یہ زحمت آپ نہ کریں تو بہتر ہے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر عید کے دوسرے ہی روز ڈاکٹر ریاض کا رشتہ رانی کیلئے

آیا وہ دوڑا دوڑا اس کے پاس پہونچا۔

"رانی پہلے اپنا ہاتھ بتانا۔" اس نے اس کی گداز ہتھیلی تھام لی۔

سرخ گل بوٹے ہتھیلیوں پہ سجے تھے۔

دیکھو میں نے بتایا تھا کہ دولہا پیار کرنے والا ہو تو مہندی کا رنگ

گہرا ہوگا۔ بے چارہ ریاض مفت میں مارا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر رانی

خوابوں میں کھو گئی۔

پھر اچانک وہ بیمار ہو گئی اسے نمونیا ہو گیا، اس کا تیماردار بنا صبیح۔

رات بھر جاگنا اور دوا وقت پر دینا، دونوں ہی کام اس کے حصہ میں آئے جب

وہ ٹھیک ہو گئی تو اس نے دیکھا، صبیح کی آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو گئے تھے۔

"تم نے میری بڑی خدمت کی، شکریہ۔" اس نے لفظوں کا سہارا لیا

"شکریہ ــــــ کتنی چھوٹی سی بات کہی تم نے۔ اس لفظ کو میرا

بس چلے تو نکال پھینک دوں۔ یہ جذبات کو ٹھیس پہونچانے والا اور حدوں کو

ختم کرنے والا لفظ ہے۔ مس رانی۔ کوئی آدمی مفت میں کام نہیں کرتا۔ ہم اپنا معاوضہ آپ سے طلب کرلیں گے۔" وہ بڑی بے نیازی سے بولا۔

"کیا لو گے ____" رانی نے پوچھا۔

"کبھی تم سے بھی خدمت لے لیں گے۔ ____" وہ بولا

"خدا نہ کرے۔ اللہ تم کو صحت سے رکھے۔" رانی نے بڑے ہی اخلاق سے کہا۔

توبہ توبہ کیا بُرا لگ رہا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کوئی ساٹھ سالہ خاتون کسی پچیس سالہ نوجوان کو دعائیں دے رہی ہے۔" وہ سگریٹ جلاتا ہوا بولا۔ وہ جل ہی تو گئی۔

"آ گئے نا اصلیت پر ____"

"ہم گئے ہی کہاں تھے۔"

"مجھے تمہاری یہی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"اور میں ان باتوں کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔"

"اور اگر میں تم سے بولنا ہی بند کر دوں تو۔"

"زبان چپ ہو گی تو آنکھیں بولیں گی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں تمہاری آنکھوں کو بند کر دوں گی۔"

"میں اپنی آنکھیں بند کر کے تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا۔"

"مجھے اس دن سارے جہاں کا سکھ مل جائے گا۔"

"نہیں اس دن تم ضرور پچھتاؤ گی اور رو کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لو گی۔

"لعنت ہے مجھ پر جو میرے آنسو تمہارے لئے یوں برباد ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اور اس کے پیچھے قہقہے بکھر گئے۔

پھر اچانک اس نے آنا بند کر دیا۔ ایک دن دو دن تین دن یوں لگا جیسے ہر طرف سکوت ہی سکوت ہو۔ امی کے مسکراتے جب چپ تھے۔ بچوں کی شرارتیں جانے کہاں چلی گئیں۔ بوڑھوں کی کمزور نگاہیں دروازے سے لگ گئیں۔ اور وہ تو ایسی خوش تھی جیسے سب کچھ پا لیا ہو۔ اس نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ لیکن جانے کیوں پھانس سی اس کے سینے میں چبھنے لگی۔ قرار میں بے قراری اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے سکون کو درہم برہم کر رہی تھی۔ تبھی امی نے گولہ داغ دیا۔

"صبیح کو کینسر ہو گیا ہے وہ ہاسپٹل میں ہے۔"

وہ سیدھے ہاسپٹل پہونچی۔ کتنا دبلا ہو گیا تھا وہ آنکھوں کے حلقے سیاہ اور ہونٹوں پر پیڑیاں سی جم گئیں تھیں۔ اس کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ رانی کے رگ و پے میں عجیب سی کسک ہونے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ وہ بہ مشکل تمام پوچھ سکی۔"

"مجھے کیا ہو گیا میں تو بھلا چنگا ہوں۔ یہ محض تمہیں بلانے کی شرارت تھی۔" وہ قہقہہ لگانے کے موڈ میں تھا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ سسٹر دوڑی اس کے قریب آئی۔ روئی سے منہ صاف کیا تو سفید روئی میں سرخ رنگ کے پھول کھل گئے۔

"یہ" "سب کیا ہے۔ اس نے روئی ہاتھوں میں اٹھائی۔ شفق میں ڈوبا آسمان آخری پہر کا زرد چاند، مرجھائے ہوئے سرخ پھول درختوں سے گرتے ہوئے سوکھے پتے اس کی نگاہوں کے سامنے پھیل گئے۔

"پچھلے دو سال سے وہ اس مرض کا شکار ہے۔ جب کبھی طبیعت

بگڑتی ہے تو یہاں اڈمٹ ہو جاتا ہے۔"

" سسٹر بتا رہی تھی اسے یاد آیا! کبھی کبھی وہ اپنے گاؤں جانے کا ذکر کرتا تھا، شاید یہی اس کا گاؤں تھا

" ان کے گاؤں سے ان کے لئے کوئی آیا" امی نے پوچھا۔

" گاؤں سے نہیں۔ انھوں نے تو کسی گاؤں کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں یہ ایڈریس دیا کہ اگر کبھی طبیعت بگڑ جائے تو اس پتہ پر اطلاع کرنا۔ سسٹر نے اس کے کیس شیٹ پر تحریر کردہ پتہ آگے بڑھایا۔ رانی نے پڑھا۔ یہ تو اس کے اپنے گھر کا پتہ تھا۔

" صبیح بیٹا تم نے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی۔" امی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

" انٹی میں اپنی ذات سے کسی کو دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے محبت بانٹی۔ سب سے پیار کیا۔ آج میں خود کو اکیلا نہیں سمجھتا۔ میں اب سکون سے مر سکوں گا۔ کوئی تو ہے جو میرے لئے آنسو بہائے گا۔"

" ہاں میں نے رانی کو بہت دکھ دیا۔" وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ اور موم کی شمع دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ ایک لمحہ گذر گیا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وارڈ میں خاموشی تھی، کبھی کبھی کسی مریض کے کراہنے کی آواز آتی۔ پھر نرس کے قدموں کی چاپ اس کے بعد گہرا سکوت۔

" رانی چپ کیوں ہو۔"

" پتھر بولتے نہیں"

کس نے کہا۔

تم نے۔ تم نے

"میں نے کیا کیا۔"

"تم نے تقدیر کو کھلونا سمجھا۔ زندگی کو قہقہہ اور احساس کو مذاق۔ سچ بتانا کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ نہیں۔ اگر ہے تو پھر یہ دھوکا کیوں؟"

"رانی میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا ایک پیار بھرا جملہ۔ تمہارے دل کے ہالے میں چاند بن کر سمٹ آئے گا اور اس چاند پر کوئی بدلی چھا جائے۔ یہ مجھے گوارہ نہیں۔" "اور تم نے سچ کو جھوٹ سے بدل دیا، خود فریبی کے آلاؤ میں تم اکیلے ہی نہیں جلے مجھے بھی جھلسا دیا۔"

"رانی میں کینسر کا مریض ہوں۔ میری زندگی کا دیا بجھنے والا ہے میری حیات کی ڈور ٹوٹنے والی ہے۔ اسی لئے میں نے اس دیئے کو تمہاری آنکھوں میں جلنے نہ دیا۔ اور اس ڈور کو تمہارے دل سے نہیں باندھا۔ مگر یقین جانو جب جب تم روٹھ گئیں میں بکھر گیا۔ جب جب تم نے نفرت کی میں ٹوٹ گیا۔ میں نے تصور میں گھروندے سجائے، خیالوں میں شہنائیاں بجائیں، خوابوں میں تمہیں دلہن بنا کر پالکی میں بٹھایا مگر حقیقت کہہ نہ سکا۔"

صحیح۔ تم نے حقیقت چھپانے کا تجربہ کیا مگر ناکام رہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ پیار ایک اٹوٹ سچائی ہے، جو دھڑکن بن کر دل میں اور نور بن کر آنکھوں میں چھپی رہتی ہے۔ زندگی میں جذبات اور احساسات کا بڑا دخل ہے۔ تم نے ان کو اپنی زندگی سے الگ کر کے خود کو تباہ اور مجھ کو برباد کیا۔

نہیں رانی ایسا نہ کہو۔ تمہیں آباد رکھنے کے لئے ہی تو میں نے یہ کھیل رچایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم میری زندگی ہو۔

"زندگی نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو۔ میں تمہارے لئے ایک پتھر سے زیادہ کچھ نہیں۔ تم نے جھوٹی تسلیوں کا ایک ایسا آشیانہ بنایا جہاں کھوکھلے قہقہہ

اور بے معنی مسکراہٹ پلنے لگی ۔ اور جب حقیقت کی بجلی اس آشیانے پر گر پڑی تو مسکراہٹ تڑپ سے اور قہقہے کسک سے بدل گئے ۔ تم نے مجھے پتھر سمجھا اور یہ نہیں جانا ۔ پتھر کا درد کیسا ہوتا ہے ۔ اپنے سینہ پر ہتھوڑے کھا کر وہ دنیا کو تاج محل دیتا ہے ۔ موم کی طرح پگھل کر اجنتا کی مورت بنتا ہے اور جب اس کا سینہ پھٹ جاتا ہے تب اس سے جھرنے بہہ نکلتے ہیں ۔" اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نمکیں پانی دھیرے دھیرے بہنے لگا ۔

"رانی Please مجھے معاف کر دو ۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو ۔"

اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا ۔

"تم ڈاکٹر ریاض سے شادی کر لو ۔" وہ بے دلی سے مسکرا پڑی ، جیسے کسی مجرم کو موت کا حکم سنا کر آخری خواہش پوچھی جائے ۔

"تمہیں میری قسم میری چاہت کی لاج رکھو ۔ میری پرستش پر داغ نہ آنے دو میری پوجا کے پھول قبول کر لو ۔"

"بہت خوب ۔ دل میرا ہے ۔ جذبات میرے احساسات میرے اور اس پر قبضہ تمہارا ۔ یہ کیسا ممکن ہے کہ سانس میں لوں اور جیو تم ، دل میرا دھڑکے اور زندہ رہو تم ۔ مسکراؤں میں اور تابندگی ملے تمہیں تو گویا ایثار ، قربانی اور وفا تم نے خرید لی ۔ اب اسے پانے کا کسی کو اختیار نہیں ۔ ٹھیک ہے ، میں تمہاری وفا کی لاج نبھاؤں گی ۔"

اس کے لہجہ میں خود اعتمادی تھی ۔ وہ گھر واپس لوٹ آئی ۔ رات بھر برسات ہوتی رہی ۔ گھر کے باہر پیپل کا درخت بھیگتا رہا ۔ صبح ہوا میں خنکی تھی اور ہر چیز نکھری ستھری ۔ ہاں کہیں کہیں کیچڑ ضرور جم گیا تھا ۔ صبح جب وہ باہر نکلی تو امی اسے دیکھتی رہ گئی ۔ سرخ ساڑی اور کلائیوں میں بھری رنگیں چوڑیاں ۔

"کہاں جارہی ہو۔ امی نے پوچھا۔ صبح کے پاس" وہ بے نیازی سے بولی۔ ——— "مگر یہ سب ———؟"

"امی۔ مرنے والا زندگی چاہتا ہے تو اسے مایوس نہیں کرنا چاہیئے نا"

اور وہ گھر سے نکل پڑی۔ ہسپتال میں بڑی بھیانک اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان وہ اسی کا نام لے رہا تھا۔

"میں آگئی ہوں صبح۔ اس نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

چھن۔ چھن۔ چھن۔ آنسو کے قطرے صبح کے گالوں پر گرتے رہے جیسے جلتے توّے پر پانی کے چھینٹے۔

"صبح آنکھیں کھولو۔ دیکھو۔ مجھے جی بھر کر دیکھو۔ میں نے تمہارا وعدہ نباہ دیا۔" اس نے ایک پل کے لئے آنکھیں کھولی، اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر ڈھلک گیا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں دید کی حسرت تھی۔

ڈاکٹر اور نرسیں دوڑ کر اس کے پلنگ کے قریب پہنچے۔ تب ہی رانی نے چوڑیوں بھرے ہاتھ صبح کے پلنگ پر دے مارے۔ چھنا چھن کے ساتھ چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

"پتھر پھوٹ گیا۔" وہ بلک بلک کر رو پڑی جیسے ندی میں باڑ آگئی ہو۔ اسی لمحے کیسی دھماکے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ شاید قریب ہی کیسی چٹان کو بارود لگا کر ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے۔

قاتل مسیحا

رات گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فلک کی چادر پر کوئی ستارہ ٹنکا ہوا نہ تھا، لگتا تھا کسی بیوہ کے آنچل کی طرح وہ بھی اداس ہے۔ رات کی اس دبیز خاموشی کا پردہ کبھی کبھی کتے کے بھونکنے کی آواز پر چاک ہو جاتا یا پھر کسی راہ گیر کے قدموں کی چاپ فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی یا پھر کسی ٹرک یا کار کے گذرنے پر خاموش دھرتی کا سینہ دہل جاتا۔

سرما کی برفیلی راتوں میں اندھیرے کا راج کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے موسم اور ماحول کے اثر سے بے خبر انسپکٹر شرما اپنے گھر کی طرف رواں تھا۔ اس کی آنکھیں آنے والے کل کے سپنے دیکھ رہی تھیں جہاں شالینی دلہن بنی اپنے پیا کے گھر وداع ہو رہی تھی۔ شالینی۔ اس کے صحرا جیسے جیون میں کھلا ہوا معصوم گلاب جس کی ہر پتی کو سنوارنے شرما نے اپنا خون جگر دے دیا تھا۔ اس کے دل کی ٹھنڈک، اس کی آنکھوں کا نور اس کی زندگی کا اثاثہ۔ شالو۔ اس کی اپنی بچی جسے اس نے ماں کی کمی کبھی محسوس نہ ہونے دی۔ اپنی جوانی کی سولہ بہاروں کا سودا اس نے بڑھاپے سے کر لیا۔ کتنی چاہ اور کتنی لگن سے اس نے شالو کا رشتہ طے کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی ساری پونجی لٹا کر شالو کو زندگی کی تمام خوشیاں دیدے۔

وہ ایک شفیق باپ تھا اور ساتھ ہی ایک ایماندار پولیس آفیسر
اُس نے جو کچھ کمایا صرف محنت ایمان اور اصولوں کے بل پر۔ اپنے ضمیر کا اس نے
کبھی سودا نہیں کیا، یہی وجہ تھی کہ شالو کی شادی کے لئے وہ پائی پائی جمع کر رہا تھا
اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ شادی کے لئے خرید و فروخت میں لگ جاتا اور دیر گئے
گھر لوٹتا، اس کا تھا بھی کون صرف شالو اور اس کی ایک رشتے کی موسی۔

آج بھی رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ مفلر گردن کے اطراف لپیٹے۔
پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا کہ دفعتاً اسے
یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نوکیلی چیز اس کی پیٹھ میں چبھ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی
سانسوں کی گرمی کا احساس بھی اس کے قریب جاگنے لگا۔

"کون ہو تم ——" اس نے ہمت سے پوچھا

"پہچانا نہیں مجھے انسپکٹر میں ارجن ہوں۔" طویل قامت،
کسے ہوئے بدن اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے شخص نے جواب دیا۔

"اوہ تم ——" شرما کے چہرے پر اطمینان تو نہ تھا مگر وہ
حوصلہ شکن بھی نہ تھا۔

"ہاں۔ میں یاد آیا نا تم کو۔ میں نے کہا تھا ہم پھر ملیں گے۔ اس وقت
میں مجبور تھا اور تم مختار۔ میں اکیلا تھا اور تم سپاہیوں کے ساتھ۔ مگر آج
میں آزاد ہوں۔ تم اکیلے ہو اور میرے ساتھ میرا یہ محافظ ہے۔" اس نے چاقو ہوا
میں لہرا دیا۔

"تم کیا چاہتے ہو ——؟" شرما نے سوال کیا۔

"تم کیا دے سکتے ہو مجھے۔ یہ جسم جو بھگوان کی دین ہے یا یہ
وردی جو سرکار کی دین ہے کچھ بھی نہیں۔ میں چاہوں تو اس وقت تمہاری زندگی

چھین سکتا ہوں، مگر نہیں ـــــ تمہاری زندگی میرے کس کام کی، میں تمہاری تڑپ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ـــــ انسپکٹر تم کو دکھانا چاہتا ہوں کہ آدمی زندگی کے نام پر کتنی بار مرتا ہے۔ اپنی لاش اپنے کاندھے پر اٹھائے کیسے پھرتا ہے۔

"مگر ان باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ـــــ اور ـــــ اور تم تو قید میں تھے نا ـــــ"

شرما نے کچھ خوف اور کچھ تعجب سے پوچھا۔

"قید ـــــ" وہ ہنس پڑا۔ اپنی زندگی سے بڑی قید کونسی ہو سکتی ہے۔ انسپکٹر جس میں میری گھائل روح لمحہ لمحہ سسک رہی ہے یہ زخم یہ گھاؤ مجھے تم نے لگایا۔

"میں نے ـــــ"

"ہاں ہاں تم نے۔ جانتے ہو اس رات میری ٹرک کو جب تم نے پکڑا تھا میں کتنا گڑگڑایا تھا تمہارے سامنے۔ کتنی منت اور سماجت کی تھی میں نے تمہاری۔ کتنے آنسو بہائے تھے۔ مگر ـــــ مگر تم فولادی کلیجہ رکھتے ہو نا تمہیں رحم کیوں آئے گا۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

"میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ مجھے کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں" شرما نے وضاحت کی۔

"جس طرح تم اپنے فرض کے پابند ہو میں بھی اس وقت اپنے کسی فرض کے احساس تلے روندا ہوا تھا۔ اپنی بہن کو وداع کرنے کے لئے مجھے پانچ ہزار روپوں کی ضرورت تھی اور وہ پانچ ہزار میں اتنی آسانی سے کسی سے نہیں لے سکتا تھا۔ کون دے سکتا تھا مجھے اتنی بڑی رقم۔ جو چیز آسانی سے نہیں مل سکتی اسے چھین

کر لیا جاتا ہے۔ اپنی بہن کی بارات کو واپس لانے کے لئے مجھے سیٹھ دھنی رام کے اس ٹرک کو چلانے کی حامی بھرنی پڑی جس میں گانجہ بھرا تھا اور جس کے عوض مجھے پانچ ہزار روپے ملنے والے تھے۔ میں نے اپنی شرافت، عزت اور طاقت کا سودا کر لیا۔ مگر تم نے عین وقت پہنچ کر میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ میری ساری خوشیاں چھین لیں۔ جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوا۔ بارات لوٹ گئی، ... دولھا منڈپ سے اٹھ گیا۔ اور میری ورشا نے زندگی سے نجات پالی۔ اپنے بھائی کی ساری فکروں کو اس نے دور کر دیا۔ وہ ہندوستانی سماج کی ایک غیرت مند بیٹی تھی جسے اپنی عزت اور لاج پیاری تھی نہ کہ اپنی جان۔ جس کا بھائی ایک اسمگلر ہو اور جس کی بارات گھر سے دٹ جائے۔ کیا کرتی وہ۔؟ سماج کے سارے گناہوں کو اپنے ساتھ جلا کر مٹانے کی کوشش کی۔

"بولو انسپکٹر! کیا تم مجھے میری خوشیاں لوٹا سکتے ہو۔ میری بہن کی زندگی واپس دلا سکتے ہو۔" ارجن کا لہجہ تیز تھا۔

"میں اس کی موت کا ذمہ دار نہیں ہوں ——"

"غلط ——" اس کی موت کے تم بھی اتنے ہی ذمہ دار ہو جتنے وہ لٹیرے جن کی مانگ میں پوری نہ کر سکا تھا وہ سماج جس نے ریت رواج کی اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دی جسے میں پار نہ کر سکا۔ وہ دولت جس کے لئے میں نے اپنی عزت نیلام چڑھا دی۔"

"مگر —— مگر تم مجھ سے یہ سب کیوں کہہ رہے ہو"

"تم سے —— اس لئے کہ تم بھی ایک لڑکی کے باپ ہو انسپکٹر اور اس کی مجبوری سے خوب واقف ہو۔ تم اپنی لڑکی کے بیاہ کے لئے پیسہ پیسہ جوڑ رہے ہو یہ میں خوب جانتا ہوں۔ مگر کیا تم اس بات کو بھول گئے کہ جہیز کا

یہ ناگ کتنی دیر سے اپنا منہ کھولے کھڑا ہے۔ تم اس میں اپنی ساری زندگی کی پونجی بھی ڈالو گے نا ——— اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ اب میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ آدمی مجبور کیوں ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر! کیا تم میرے ان سسکتے ہوئے لمحوں کا کچلی ہوئی آرزوؤں کا، ناکام حسرتوں کا حساب چکا سکتے ہو۔ میری بہن کی زندگی واپس لا سکتے ہو۔ نہیں ——— تم ایسا نہیں کر سکتے، مگر میں تم سے ایک ایک پل کا حساب لوں گا۔

"مجھے مارنے سے تمہیں کیا ملے گا ———"

میں تمہیں ماروں گا نہیں انسپکٹر۔ تمہیں بتا دوں گا کہ اپنی ہی موت پر آنسو کیسے بہائے جاتے ہیں۔

"مگر میرے آنسوؤں سے تمہیں کیا ہوگا ———"

چین ملے گا مجھے۔ درشا کی آتما کو شانتی ملے گی۔ جو آگ میرے سینے میں بھڑک رہی ہے اسے میں تمہارے آنسوؤں سے بجھاؤں گا۔ میں جانتا ہوں تم اتنی آسانی سے آنسو نہیں بہاؤ گے اس کے لئے تمہیں بہت بڑی قیمت دینی پڑے گی۔ اور وہ تمہاری بیٹی سے بڑھ کر نہیں۔" ایک لمحے کے لئے ارجن کی آنکھوں میں خوفناک چمک پیدا ہو گئی۔

"نہیں ارجن ——— تم ایسا نہیں کر سکتے۔ شالو میری زندگی کا حاصل ہے۔"

اور درشا میری زندگی کی پونجی تھی ——— ارجن کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درد سمٹ آیا۔

میری سزا میری معصوم بچی کو نہ دو۔ شرما کے لہجے میں التجا تھی

"دنیا کا یہی دستور ہے انسپکٹر۔ بیج کوئی بوتا ہے اور فصل کوئی کاٹتا ہے۔" میں اپنے فرض سے مجبور تھا۔

"اور میں اپنی ضد سے مجبور ہوں۔ میرا وقت برباد نہ کرو مجھے اپنے گھر لے چلو۔" ارجن نے جھنجھلا کر کہا اور شرما کے پیر آپ ہی آپ اٹھ گئے۔ دروازے پر پہونچ کر اس نے کال بیل بجائی۔ شالو نے دروازہ کھولا۔

"آج پھر دیر لگادی نا۔ پتاجی۔ کتنی بار میں نے کہا آپ سے جلد آئیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے، آئیے اندر منھ ہاتھ دھولیں کھانا لاتی ہوں۔" ایک ہی سانس میں وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ایک لمحے کے لئے شرما اور ارجن کی نظریں ملیں، ارجن کی آنکھوں میں خوفناک چمک تھی۔ اور شرما کے چہرے پر موت کی زردی۔ شرما کے ساتھ وہ بھی اندر چلا آیا۔

"یہ ——— یہ کون ہیں پتاجی ———" ارجن کو دیکھ کر شالو نے پوچھا۔

"یہ ——— یہ بیٹی۔ اسے تم اپنا بھائی سمجھو۔" شرما کا یہ جملہ ارجن کے لئے اتنا مہلک ثابت ہوا کہ وہ اپنی سانس بھی لینا بھول گیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

"آپ کی طبیعت خراب تو نہیں۔ پانی لے آوں۔ اتنی سردی میں اتنا پسینہ کیوں آگیا آپ کو۔"

اور معصوم شالو نے اپنے آنچل سے اس کا ماتھا صاف کیا، بس یہی وہ لمحہ تھا جب شیطان نے منھ چھپالیا اور انسان کا چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ اسی پل وہ باہر نکل گیا۔

"ارے یہ تو چلے گئے پتاجی" شالو اندھیرے میں دور تک اسے

جاتا دیکھتی رہی

"ارے جانے دو بیٹی ۔" شرما نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا، مگر ایک پھانس ان کے کلیجے میں جیسے چبھ گئی ۔

خوف اور اندیشوں کے سائے جب انسان کے اطراف منڈلانے لگتے ہیں تو اسے کسی پل چین نہیں مل سکتا ۔ شرما کو بھی لگ رہا تھا جیسے کوئی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہے ۔ کوئی آگ اس کے دل میں بھڑک رہی ہے ۔ کوئی شیشہ اس کے کلیجے کو کاٹ رہا ہے ۔

" اسی امروز و فردا میں شادی کا دن قریب آگیا ۔ شادی کے دعوت نامے لے کر جب شرما گھر لوٹے تو دینا ناتھ کا بھیجا ہوا خط ان کے ٹیبل پر رکھا ہوا پایا گیا ۔ جلدی سے انھوں نے لفافہ چاک کیا ۔ جس میں تحریر تھا کہ جب تک پچاس ہزار روپیوں کا انتظام نہ ہوگا ۔ وہ بارات لے کر نہیں آسکتے ۔" اس اچانک اور غیر متوقع بات نے شرما کو دہلا دیا ۔ وہ کانپ گئے ۔ شالو کا معصوم چہرہ ان کے سامنے آگیا قبل اس کے کہ وہ تیورا کر گر پڑتے ۔ شالو نے انھیں تھام لیا ۔

"پتا جی —— کیا ہو گیا آپ کو ۔"

" شالو ..... میری بیٹی ۔ اب میں کیا کروں ۔" ان کے لبوں پر بے جان سے جملے مچل گئے ۔

تبھی کسی نے کال بیل بجائی ۔ شالو نے شرما کو تکیے کے سہارے بٹھایا اور دروازہ کھول دیا ۔ ارجن اس کے سامنے تھا ۔

" بھیا ..... بھیا آپ اچھے سمے پر آگئے ۔ دیکھیے پتا جی کا کیا حال ہو گیا ۔ گھر میں کوئی بھی نہیں ۔ شالو نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا ۔

" کیا بات ہے شرما جی ۔" ارجن کو دیکھ شرما کو جیسے سکتہ سا ہو گیا

انہیں اپنی زندگی کی نیا ڈولتی دکھائی دینے لگی۔

تم ——— تم کیوں آئے ہو۔ ——— نکل جاؤ یہاں سے۔

میں .... میں پولیس کو فون کروں گا۔ چلے جاؤ...... چلے جاؤ یہاں سے"۔

شرما کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

ضرور فون کر لینا۔ پہلے مجھے بات کر لینے دو۔ دینا ناتھ کا خط آیا

تھا نا! میں جانتا ہوں۔

"تم ——— تم کیوں پریشان ہو۔ سنو! تمہاری بیٹی ہے اور میری

بہن"۔

"انیل اندر آؤ ———" ایک نوجوان اس کے بلانے پر اندر

داخل ہوا۔

"یہ انیل ہے۔ گورنمنٹ کالج میں لکچرر ہے۔ اس کی کوئی مانگ

نہیں۔ وہ صرف پتنی چاہتا ہے۔ شانو کے لئے اس سے بہتر کوئی رشتہ نہیں۔"

ارجن کے اس غیر متوقع جواب سے شرما حیران رہ گیا۔

"لیکن میں تمہیں جانتا ہی نہیں ———؟ شرما کے لب ہلے۔

میں اپنے بارے میں آپ کو خود بتائے دیتا ہوں۔ میں وہی شخص ہوں

جسے منڈپ سے اٹھایا گیا تھا۔ جسے دولت کے ترازو میں تولا گیا تھا۔ وہ

ارجن بھیا کی ہی بہن تھی۔ ——— جس کی موت کا میں ذمہ دار ہوں۔

نہ میں اپنے پتا کے کہنے سے منڈپ سے اٹھتا، نہ بارات لوٹتی اور نہ وہ

اپنی جان دیتی۔

ورشا کی موت کے بعد میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ مجھے سماج کے

ان اصولوں سے، ان رواجوں سے نفرت ہوگئی۔

میں خود کو بہت نیچا محسوس کرنے لگا۔ میں اپنی نظر میں گر چکا تھا۔ اپنے پاپ کا پرائیشیچت کرنے میرے پاس کچھ نہ رہا۔ تب میں ارجن بھیا کے پاس واپس لوٹا اور انھوں نے مجھے راہ دکھائی۔"

انیل کی باتوں سے شرما کے ڈوبتے دل کو تسلی ہو گئی۔ اور وہ ارجن کے بارے میں سوچتے رہے۔

ارجن ——— آخر کون ہے؟

قاتل یا مسیحا؟

وقتِ سفر یاد آیا....

خوشبو کا تیز جھونکا اسلم نواب کے کمرے کی فضا کو معطر کر گیا۔ وہ گہری نیند سے چونک پڑے۔ پیروں پر پڑی لحاف پرے ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر انھوں نے برش لیا اور اپنے سفید بالوں میں پھیرنے لگے تبھی، یوں لگا جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔

"جب کبھی آئینہ دیکھئے گا تو محسوس کریں کہ دو آنکھیں آپ کا صدقہ اتار رہی ہیں۔" انھوں نے فوراً ہی پیچھے مڑ کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ بس ایک خوشبو تھی جو فضا کو معطر کر گئی وہ اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئے۔

صحن کے ایک کونے میں چنبیلی کا منڈوا اداس اداس سا کھڑا تھا مگر جس کے دامن میں سینکڑوں اجلے اجلے خوشبودار پھول تھے۔ انھوں نے معمول کے مطابق پھولوں کی ٹوکری اٹھا لی اور پھول چننے لگے اس کے ساتھ ہی ماضی کے بند کواڑ کھل گئے اور یادیں دھیرے دھیرے ذہن کے افق پر ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں۔

"یہ فرح ہے۔ ہاشم نواب کی پوتی۔ گردشِ دوراں کا شکار ہو کر ہماری پناہ میں آگئی۔ اب یہ یہیں رہے گی۔" ایک خوشگوار صبح کو امی نے انھیں

بنایا۔ ایک سانولا مجسمہ ان کے روبرو تھا۔

"ٹھیک ہے!" اور وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے نکل گئے، جیسے وہ کوئی بالکل ہی غیر اہم شئے ہو۔ حالانکہ فرح کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ کائنات اس کی ملکوتی مسکراہٹ پر ساکت ہو سکتی ہے مگر یہ...... یہ تو خیر ...... وہ بے دلی سے مسکرا کر چپ ہو گئی جیسے سوچ رہی ہو دیکھیں ہم بھی لوہا کب تک شکل نہیں بدلتا۔

پھر اسلم میاں نے محسوس کیا گھر میں نقرئی گھنٹیوں کی آواز آنے لگی تھی۔ چوڑیوں کے جل ترنگ بجتے رہے۔ گنگناہٹ سے خاموشی جاگنے لگی تھی۔ ویرانوں میں کوئل کوکنے لگی زمین پر پازیب کی جھنک گونجنے لگی۔ فضا میں خوشبوئیں بکھرنے لگیں۔ راتوں میں چاند آنگن میں اتر آنے لگا۔ ان کے کمرے کی ہر چیز قرینے سے سجی رہتی۔ کھانے کے لئے نئے نئے لوازمات ٹیبل پر لگ جاتے اور شام کے دھندلکوں میں چنبیلی کے منڈوے سے ایک سریلی آواز کانوں میں رس کے گھولنے لگتی۔

ایک شام ریکٹ ہاتھ میں لئے وہ ٹینس کھیل کر واپس ہو رہے تھے کہ صحن کی سیڑھیوں پر ہی ان کی ملاقات فرح سے ہوئی۔ خدا جانے وہ دانستہ تھی یا نادانستہ۔ پھولوں کی ٹوکری میں بے شمار پھول لئے وہ اسی جانب آرہی تھی۔ دفعتاً انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے پیروں کو نہایت ہی ملائم شئے چھونے لگی ہو۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھلتے فرح ان کی باہوں میں جھول گئی۔ اور چنبیلی کے سارے پھول اسلم میاں کے قدموں میں ـــــــ! وہ اس غیر متوقع حادثے سے گھبرا گئے۔ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ کر انھوں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی نبض تیز چل رہی تھی۔ انھوں نے دھیرے دھیرے اس کا سر سہلایا، چند ہی لمحوں بعد اس نے

آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے فرح۔"

"جی کچھ نہیں۔ یونہی چکر سا آگیا تھا۔" اس کی نظریں اسلم میاں کی مخمور نگاہوں سے ٹکرا کر پلٹ گئیں۔

"اپنا خیال رکھا کرو۔" انھوں نے بڑی متانت سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ایک منٹ کے لئے رکئے۔ مجھے انھیں چن لینے دیجئے۔" اور وہ جھک کر اسلم میاں کے پیروں پر گرے پھول چننے لگی۔ گویا ان کی محبت سمیٹنے لگی ہو۔

اس روز شائد کچھ نذر و نیاز تھی۔ اسلم میاں سیاہ شیروانی میں ملبوس یونانی دیوتاؤں کا مجسمہ لگ رہے تھے۔ مہمانوں کی آمد و رفت تھی اور وہ ان کا استقبال کر رہے تھے۔ دفعتاً زنان خانے سے شور اٹھا کہ فرح بے ہوش ہوگئی ہے۔ اسلم میاں بھی اندر پہونچے۔ دالان کے بیچوں بیچ وہ پڑی تھی۔ لوگ گھیرے ہوئے تھے، کوئی پانی کے چھینٹے مار رہا تھا، کوئی آنچل کی ہوا دے رہا تھا اور کوئی خوشبو سونگھا رہا تھا۔ اسلم میاں قریب پہونچے اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور نبض دیکھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا سر سہلاتے ہوئے پکارا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ نیم خوابی کے عالم میں اس نے ان آنکھوں کو دیکھا جس میں زندگی رقصاں تھی۔

"کیا بات ہے فرح؟"

"جی کچھ نہیں آپ کی گود میں سر رکھنے جی چاہا تو میں نے...... !"

قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہتی انھوں نے اس کا سر اپنی گود سے ہٹا دیا اور پیشانی پر سلوٹیں لئے باہر نکل گئے۔ اس شام انھوں نے امی سے کہہ دیا۔

"امی! فرح کو سمجھا دیجئے۔ وہ اپنے حدود میں رہا کرے، پناہ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مکین بننے کا دعویٰ کرے۔ آپ جانتی ہیں میں ایسی حرکتیں پسند نہیں کرتا۔"

"وہ الھڑ ہے شوخی اور شرارت اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ سب سے ہنس بول کر ہی تو وہ اپنے دکھ بھلا لیتی ہے۔" امی نے تائید کی۔

"چلیے وہ سارے زمانے سے ہنس بول لے مگر میرے اصولوں کے خلاف جانے کی کوشش نہ کرے۔" وہ کرسی سے اٹھ کر باہر چلے گئے

پردے کی اوٹ میں کھڑی فرح سب کچھ سنتی رہی۔ دل میں کرب اٹھا مگر لب ہمیشہ کی طرح مسکراتے رہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس بار آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

وہ ایک دن چولھے کے پاس دودھ گرم رہی تھی اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے امی۔" "ہم پر بہت بڑی ذمہ داری ہے میں نے فرح کے رشتے کے لئے کہہ دیا ہے بات پکی ہوجائے تو اسی ماہ اس کے ہاتھ پیلے کر دیجئے۔" یہ اسلم میاں ہی تو تھے جو ضرب پہ ضرب لگائے جا رہے تھے وہ جانتی تھی کہ اسلم میاں اپنے اصولوں کے بہت پابند ہیں۔ اپنی امی کے سوا کسی دوسری عورت کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ رشتے ناطے کی بہنیں تھیں مگر ان سے بات کرنا تو کجا ان کا سایہ بھی خود پہ نہ پڑنے دیتے۔ مگر وہ یہ کیا کرے دل۔ . . . یہ کم بخت دل کیوں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ ایسے چاند کے لئے اپنا ہاتھ پھیلانے لگی جو اس کے آنچل میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ساری دنیا کو چاندنی بخشنے والا چاند اس کے دامن میں کیسے

سمٹ کر محدود ہو جاتا۔ وہ اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب سارا دودھ جل کر بو آنے لگی تھی۔ اس کے دل سے ایک سرد آہ نکلی۔

اسی شام جب وہ ان کے کمرے میں دودھ کا گلاس لئے پہونچی تو کسی ناول کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ اس کے آنے کا انھیں احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر اچانک جانے کیا ہو گیا وہ چکرا کر ان کے پیروں پر گر پڑی۔ اسلم میاں نے گھبرا کر کتاب پھینک دی۔ سارا دودھ فرش پر پھیل گیا تھا۔ اس کے ماتھے اور رخسار پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ انھوں نے اس کا سر سہلا دیا، کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم جان بوجھ کر ایسی حرکت کرتی ہو یا پھر واقعی تمہیں کوئی مرض ہے۔"

اسلم میاں نے پوچھ لیا۔ اس نے نیم خواب نگاہوں سے دیکھ کر کہا

"ہم نے پالا مدتوں پہلو میں ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا۔"

اسلم میاں کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو ——— ؟"

"تجھ سے ملے نہ تھے تو کوئی آرزو نہ تھی
دیکھا تجھے تو تیرے طلب گار ہو گئے"

وہ بدستور مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

کیا مطلب ——— !

تمہیں نگاہوں کی جستجو ہو
تمہیں خیالوں کا مدعا ہو

تمہیں میرے واسطے صنم ہو
تمہیں میرے واسطے خدا ہو
میری پرستش کی لاج رکھ لو
میری عبادت قبول کر لو۔

"بکواس، واہیات۔ کیا ہو گیا تمہیں فرح۔ جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو۔ تمہاری نادان حرکتوں سے میں تنگ آگیا ہوں۔ مجھے اپنی انا اور وقار سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں۔ محبت کی بے ہودہ باتیں پاگلوں کے دماغ کی اختراع ہیں۔ میں نے تمہیں سہارا دیا ہے۔ قسمت کی لکیر نہیں بنائی میں صرف تم سے ہمدردی کر سکتا ہوں۔ اس کے آگے جانے کی کوشش مت کرو۔"

وہ بے حد جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے وہ سمٹی سمٹی سی پریشان حال یوں کھڑی تھی جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کی عزت نیلام کر دی ہو

"مجھے ——— مجھے معاف کیجیے گا، شاید میں اپنی حیثیت بھول گئی تھی۔" یہ مشکل تمام وہ اتنا کہہ سکی اور کرب سے اس کی آنکھوں میں نمی سے تیرنے لگی مگر ملکوتی مسکراہٹ بدستور ہونٹوں پر قائم رہی۔

پھر اچانک وہ جب چپ سی ہو گئی۔ اس کی اداس آنکھیں ہمیشہ سرخ رہنے لگیں۔ ہاں ملکوتی مسکراہٹ بدستور قائم رہی شاید اس لئے کبھی تو اس کے غم کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔

اسی دوران اس کا رشتہ طے کر دیا گیا وہ اقرار اور انکار دونوں ہی لفظوں سے نا آشنا اپنی زندگی کی ناؤ کھیتی رہی پھر اس کی منگنی کا دن بھی آگیا

اسلم میاں ہر جذبے سے بے نیاز کام میں مصروف تھے۔۔ فرح جھلمل لباس میں سچ مچ سلونا مجسمہ لگ رہی تھی۔ نہ سکھ نہ دکھ۔ نہ خوشی

نہ غم، کوئی بھی احساس اس کے وجود سے لپٹا ہوا نہ تھا۔ بس ایک خاموشی تھی۔ چیختی چلاتی خاموشی، اداس اور گمبھیر خاموشی، سسکتی اور دم توڑتی خاموشی مگر اس خاموشی میں کتنے الفاظ پنہاں تھے، کتنے جملے پوشیدہ تھے کتنی باتیں سمٹی ہوئی تھیں ان کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ فرح گھل رہی تھی جیسے کوئی گوندھی ہوئی مٹی پانی میں گھل گھل کر اپنی ہستی کو مٹا ڈالتی ہے۔ شکوہ شکایت گلہ یہ سب تو ان کیلئے ہے جو دل کے کسی ڈور سے بندھے رہتے ہیں اور یہاں تو بس ایک لفظ ہمدردی اور سہارے کا تھا تو پھر بھلا وہ ان احسانوں کے آگے اور طلب بھی کیا کر سکتی تھی

منگنی کی رسم کے کچھ ہی لمحے بعد شور اٹھا کہ فرح بے ہوش ہو گئی ہے

اسلم میاں کو جانے کیوں اس بار طیش آ گیا۔ وہ بہت دیر بعد اندر پہونچے۔ سانولے مجسمے کی شفاف پیشانی پسینے کی بوندوں سے جگ مگ کر رہی تھی۔ گالوں پر چھڑکی گئی۔ افشاں اس کا صدقہ اتار رہی تھیں۔ اسلم میاں قریب پہونچے۔ ناگواری کے تاثرات ان کے چہرے سے عیاں تھے بادل ناخواستہ اسے ہاتھوں پر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے اور پلنگ پر لٹا کر دھیرے دھیرے اس کا سر سہلانا شروع کیا۔ بند کلیاں دھیرے دھیرے چٹکنے لگیں پلکوں میں جنبش ہوئی تو پہلا دھاکہ یوں ہوا۔

"اچھا ڈرامہ کر لیتی ہو، مجھے بلانے کے لئے اتنے گھٹیا طریقے کی کیا ضرورت تھی، محفل میں تماشا بن کر خود کو رسوا اور مجھے بدنام کرنے پر آمادہ ہو۔ جس عزت و ناموس کی پاسداری میرے لئے جان سے بھی عزیز ہو تم اسی کو سر بازار دار پر چڑھا رہی ہو"

ان کی بڑی بڑی عمیق نظریں شعلہ بار بن گئیں۔ وہ ان کی لپیٹ میں جھلسنے لگی۔

"مجھے غلط نہ سمجھئے میں سچ مچ اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اعتبار

کیجئے میری قسم ....." اس نے حنائی ہاتھ سر پر رکھ لیا۔

"کہاں کھو جاتے ہیں تمہارے ہوش۔ تم اپنی زندگی کو کھلونا اور میری عزت کو مذاق سمجھتی ہو۔ تمہاری ان نادان حرکتوں سے میں تنگ آگیا ہوں۔ اپنی نہیں تو کم از کم میری عزت کا خیال تمہیں رکھنا چاہیئے"... اور اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔

اسی امروز و فردا میں شادی کا دن بھی آگیا اس کے لئے راتیں اماوس کی اور دن صحراؤں کی تپتی دھوپ بن گئے۔ نکاح کی رسم کے بعد ایجاب و قبول کیلئے جب اسلم میاں اندر پہونچے تو فرح نے جھلملاتے گھونگھٹ کی اوٹ سے انھیں دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں جھپکتے جھپکتے بند سی ہونے لگیں۔ سرخ کپڑوں کی سی گٹھری جیسے ڈھلک گئی۔

"ارے یہ تو بے ہوش ہو گئی۔" کسی نے کہا اور وہ اس کے قریب گئے بنا ہی باہر لوٹ گئے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا مگر وہ ہوش میں نہ آپائی، تب مجبوراً وہ ڈاکٹر کے ہمراہ اندر پہونچے، جانے کیوں اس بار اندیشوں نے انھیں گھیر لیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور باہر آگیا۔

"کوئی خاص بات ڈاکٹر ـــــــ" اسلم میاں نے رُکے رُکے لہجے میں پوچھا۔

"انہیں یہ مرض کب سے ہے۔" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"کیا اس سے قبل بھی انھیں ایسی بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا۔" دوسرا سوال ہوا

"جی..... جی ہاں" اسلم میاں کی پیشانی عرق آلود تھی۔

"اس وقت ان کی حالت بہت سیریس ہے۔ آپ کو کسی نے بتایا

نہیں کہ یہ دل کی مریض ہیں۔ اور ایسے مریضوں کے لئے شادی خطرہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اس وقت ان کا ہارٹ سنکنگ پوزیشن میں ہے" ڈاکٹر نے تفصیل سمجھائی۔ اسلم میاں کی انا ان کا وقار ان کی عزت ہچکولے کھاتی کشتی کی طرح طوفان میں ڈوبنے ابھرنے لگی۔

"اب کیا ہوگا ——— ؟ اسلم میاں بہ مشکل کہہ سکے۔

"خدا رحم کرے۔ ہوش آ بھی جائے گا تو زیادہ دیر نہیں رہے گا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ شہنائیاں رو رو کر چپ ہوگئیں۔ پھولوں کے انبار اداس ہوگئے۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ مدھم ہوگئی۔ یہ کیسا وقت سفر تھا۔ یہ کیسی وداعی تھی۔ یہ کیسی محفل تھی۔ اسلم میاں نے یکلخت آگے بڑھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"فرح، آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو۔ . . . . . میں . . . . میں مجھے تم نے دیوتا مانا۔ میں نے آج تمہاری پوجا کے سارے پھول چن لئے۔ تمہاری وفا نے جذبۂ محبت سے مجھے آشنا کر دیا۔ میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔ تم میری ہو، فرح۔ صرف میری۔"

وہ دیوانہ وار کہہ رہے تھے۔ اور ساری محفل ششدر تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سانسوں کو یکجا کر کے اس نے آنکھیں کھولیں۔

"زہے نصیب۔ آپ نے میری عبادت قبول کر لی۔" اور اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ اسلم میاں چیخ اٹھے۔

"نہیں فرح تم نہیں مر سکتیں۔ تم میری ہو صرف میری۔ صرف میری"

مگر طائر قفس سے آزاد ہو چکا تھا۔

فرح کس منزل کی مسافر تھی۔ اس کا وقت سفر کتنا دردناک اور اذیت ناک تھا، اسے کوئی بھلا نہ سکا اور آج بھی بیس برس گذرنے کے باوجود

اسلم میاں کے کمرے میں خوشبو کے تیز جھونکے فرح کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور وہ پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لئے لڑکھڑاتے قدموں سے قبرستان کا رخ کرتے ہیں۔

اس کی قبر پر پھول چڑھانا اور چند آنسو چھلکانا ان کا معمول بن گیا۔

شاید وفا کا یہی تقاضا ہے۔ شاید گناہ کا کفارہ ایسے ہی ادا کیا جاتا ہے۔

دِل ڈھونڈتا ہے.....

وہ بڑی دیر سے راہ تک رہی تھی۔ آسمان پر دور دور تک سیاہی پھیل ہوئی تھی۔ کبھی کبھار بجلی چمک کر زندگی کا احساس دلاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جل رہی تھیں۔ گالوں پر سنہرے سپنے سجے تھے۔ لبوں پر بادۂ سحر کا نشہ، آنکھوں میں چاہت کا خمار۔ اگرچہ فلک کی سیاہی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے دل میں آس کا ننھا سا دیا ٹمٹمارہا تھا۔

دفعتاً فلک کے ایک گوشے سے ستارہ ٹوٹا اور زمین کی پنہائیوں میں گم ہوگیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک گئیں۔

"نہیں ــــــ ایسا نہیں ہوسکتا ــــــ وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا ــــــ" دھڑکتے دل سے صدا نکلی اور اس کا سارا وجود جیسے بھیگ گیا۔ یوں لگا جیسے گلاب کی نازک پتی بارِ شبنم نہ سہہ سکی ہو۔

عنبرینہ ــــــ میں تمہارا ہوں۔ تمہاری رگِ جان کے قریب ہوں۔ تمہاری نس نس میں ہوں۔ تمہاری ہر سانس میں ہوں۔ تمہاری

روح کی گہرائیوں میں ہوں، تمہارے دھڑکتے دل کی صدائیں ہوں۔ تمہاری زلفوں کی مہک میں ہوں۔ تمہارے لبوں کی سرخی میں ہوں۔ تمہارے پلکوں کی نمی میں ہوں۔ تمہارے عارض کے بھنور میں ہوں۔ تمہاری آنکھوں کے پیمانے میں ہوں۔ میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔"

یہ جملے اس کے دردِ دل پر دستک دینے لگے اور وہ بند کواڑ کھولنے لگی.....

اس دن بارش کھل کر برسی اور مدتوں بعد جیسے دھوپ کی چاندنی فضا میں پھیل گئی۔ ہر چیز اُجلی اُجلی نکھری نکھری سی تھی جیسے سارا میل قدرت نے دھو دیا ہو، مٹی کے ذروں میں بھی عجیب سی چمک آگئی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین نگینے اگلنے لگی ہو۔

اس کی کار فراٹے بھرتے رینگ رہی تھی دفعتاً بریک کا جھٹکا لگا جس نے خود اس کے وجود کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔

اور جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا اس کے روبرو سفید کپڑوں میں ملبوس کوئی شخص بستر پر دراز تھا۔

"میں..... میں کہاں ہوں ــــــ" مریض نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"تم محفوظ ہو ــــــ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" یہ ڈاکٹر کی آواز تھی۔

"لیکن یہ ــــــ یہ سب کیسے ہوا ــــــ" اس نے اپنا زخمی بازو سہلا کر کہا۔

"اتفاق کی بات ہے۔ تم ان کی کار سے ٹکرا گئے۔" اسی لئے تمہیں ہاسپٹل آنا پڑا۔"

"میں ..... میں ٹکرا گیا ــــــ یا میری تقدیر ٹکرا گئی۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے عنبرینہ کو دیکھا۔ وہ کچھ گھبراہٹ اور کچھ ندامت کے سایہ میں پناہ لے رہی تھی۔

"ہم ..... معاف کیجئے۔ میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔" عنبرینہ کے یاقوتی لب کھلے۔

"معافی کا یہ انداز بھی نرالا ہے۔ لگتا ہے گھائل کرنا آپ کا شوق ہے۔" اس بار اس کے لہجے میں کچھ تلخی سی آ گئی۔

"ڈاکٹر میں گھر جانا چاہوں گا ــــــ"

"ضرور جائیے مگر آج نہیں کل ــــــ او کے ــــــ"

ڈاکٹر اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

"کل ــــــ یہ "کل" بہت خطرناک لفظ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کی ڈکشنری سے اسے نکال پھینکا ہے، کیا آپ اس کل کی قائل ہیں۔"

ــــــ اس کا سوال عنبرینہ کو انوکھا لگا۔

"کہیں آپ شاعر تو نہیں ــــــ اس نے پوچھ لیا

"ایک مکمل غزل اگر سامنے آ جائے تو شاید شاعری کر ہی لوں۔"

اس کی نظریں بڑی عمیق ہو گئیں۔

"جی ــــــ" عنبرینہ کا منھ کھل گیا جیسے گلاب کی بند کلی چٹک گئی ہو۔

"اچھا یہ بتایئے آپ مجھے ہاسپٹل کیوں لے آئیں۔ وہیں

سڑک پر کیوں نہیں چھوڑ دیا ـــــ"

"انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے ـــــ" عنبرینہ نے جواب دیا۔ وہ ایک بھیانک قہقہہ لگا بیٹھا۔ عنبرینہ گھبرا سی گئی۔

"آپ شاید گھبرا گئیں۔ مجھے پاگل سمجھ لیا ہوگا ـــــ سچ تو یہ ہے کہ یہ لفظ اتنا بوسیدہ ہو گیا ہے کہ اسے پیوند بھی نہیں دیا جا سکتا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ـــــ" عنبرینہ حیرت میں پڑ رہی تھی۔

"آپ کیا کرتے ہیں ـــــ؟"

"غم روزگار کا مارا ہوں تلاش معاش کرتا ہوں مگر ...."

"میرے پاپا کی فیکٹری میں آپ کام کریں گے ـــــ" عنبرینہ نے پوچھا۔

"نوازش ـــــ کرم ـــــ مہربانی"

اور پھر مسافر کو منزل، بیمار کو مسیحا، زخم کو مرہم، درد کو درمان مل گیا۔

"اس روز اگر میں تمہاری کار سے نہ ٹکراتا تو پھر محبت اور نوازش کی یہ سوغات کہاں ملتی مجھے ـــــ" اس کی آنکھوں میں جیسے ارمان جھانک رہے تھے۔

"باتیں بڑی اچھی کرتے ہو تم ـــــ" عنبرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موتیوں کی قطار چمک اٹھی۔

"یہ انداز بھی تم ہی نے سکھایا۔ بتوں کو دیکھ کر ہی تو بت پرستی آتی ہے۔"

"سچ مچ بڑی دلنواز باتیں ہیں تمہاری۔"

"دلنوازی کے ساتھ جاں نثاری بھی ہمارا شیوہ ہے۔"
دور کسی پرندے نے آواز لگائی اور فضا کا سکوت دم توڑ گیا

آنسو کا ایک قطرہ اس کے گالوں پہ ٹھیرا ہوا تھا۔ اس نے آنچل سے چہرہ صاف کیا اور نیچے بیٹھ گئی۔ مٹی پر آڑے ٹیڑھے لکیریں کھینچتی ہوئی وہ پھر ماضی کے صحیفے الٹنے لگی........

"جانے وہ کونسا لمحہ تھا وہ جب تم مجھ سے ملیں، زندگی کی ساری رعنائی مل گئی مجھے مگر خوف ہے وقت کا خطرناک پہرہ دار مجھے جکڑ نہ لے، تم سے دور نہ کر دے ——" اس شام جب سورج ڈوب رہا تھا اس نے عنبرینہ سے کہا۔

"کیا تم سچ مچ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو۔" عنبرینہ نے کریدا۔

"پیار —— ہونہہ" وہ بے دلی سے مسکرا پڑا۔ اس نے ایک مٹی خاک اپنے ہاتھ میں بھر لی اور پھر اسے فضا میں بکھیر دیا۔

"دیکھا تم نے خاک پھر خاک میں مل گئی۔ میں بھی تم میں ایسے ہی سما جانا چاہتا ہوں۔ تم اور میں میں اور تم ایک ہو جائیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے ——"

"تم اسے نہیں مان سکتیں۔ یہ تمہارا خیال ہے اور میں اسی کو زندگی کی سب سے بڑی سچائی مانتا ہوں۔ تم مجھے مل گئیں گویا جنت مل گئی اور تم مجھ سے بچھڑ گئیں تو گویا میں بے جان ہو گیا۔ تم کو نہ پاسکا تو تمہارے قدموں کی خاک کو پالوں گا۔ اس خاک کو اپنا لوں گا جس خاک پر تمہارے نقش پا کا عکس ہو، یہی میری محبت کی معراج ہے۔" وہ جذبات میں ڈوب گیا۔

"اتنے جذباتی مت بنو —— سنجیدگی سے سوچو اس کا

حل کیا ہوگا۔" عنبرینہ تلاش منزل چاہ رہی تھی۔

"میں نہیں جانتا ——— ہوسکتا ہے تم اسے دل لگی سمجھو اور میں دل کی لگی۔ سماج، دولت، خاندانی رسم ورواج، اونچ نیچ ذات پات یہ تمام باتیں ہر دور میں محبت کی دشمن رہی ہیں۔ پتہ نہیں میری چاہت کو کونسا ناگ ڈس لے گا میں جانتا ہوں ایک مفلس شاعر کسی دولت مند حسینہ کو صرف محبوبہ بنا سکتا ہے۔ شریک زندگی نہیں، لیکن یہ کیا کم ہے کہ تم میری نگاہوں کی جنّت میرے خیالوں کا مدعا، میرے غم کا مداوا ہو، تم ہی میرے لئے صنم ہو تم ہی میرے لئے خدا ہو۔"

"کلمات کفر اچھے نہیں ——— عنبرینہ نے چہک کر کہا۔

"اس کی سزا موت کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ مگر ہر قطرۂ خون تمہارا ہی نام لکھے گا۔" شاعر کی محبت معراج پر تھی۔ عنبرینہ کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی جیسے آسمان شفق میں ڈوب گیا ہو۔

ایک صبح جب ستارے تھک چکے تھے۔ چاند سوگوار ہو رہا تھا عنبرینہ کے مکان پر کال بیل بج اٹھی، گلابی نائٹ گون میں ملبوس آنکھیں ملتی وہ باہر نکلی۔

تعجب، خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اس کا چہرہ سورج کی پہلی کرن کی طرح تابناک ہوگیا۔

"آپ ——— !!"

"ہاں ——— میں ———" وہ سوٹ کیس لئے اندر داخل ہوا

"اچانک، اتنے دن بعد ——— بغیر اطلاع ———"

عنبرینہ نے سوالات کی بوچھار کردی۔

"ان تفصیلات میں مت جاؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک پرانا پاپی اپنی دیوی کے آگے پچھتاوے کی آگ میں جل کر معافی کی بھیک مانگنے آگیا ہے۔ خطاوار ہوں جو چاہے سزا دو مگر اتنا یقین رکھو تم سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی میں تم سے دور نہ رہ سکا۔" آنے والے مہمان نے عنبرینہ کے ہاتھ تھام لئے

ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

"تمہیں خوشی نہ ہوئی میرے آنے کی ـــــ!"

"نہیں صوفی۔ یہ بات نہیں۔ میں تو ابھی تک اسی غفلت میں ہوں کہ شاید محو خواب ہوں۔"

"تمہارے خواب اب حقیقت بن جائیں گے۔ تمہارا انتظار اب رنگ لائے گا۔ حنائی سرخی ہتھیلی پر پھیلے گی۔ مانگ میں افشاں چمکے گی سرخ گھونگھٹ میں چاند جگمگائے گا۔ غم روزگار نے بہت دور کر دیا تھا، مجھے تم سے۔ چار سال کی طویل مدت تم نے کتنے کرب و اضطراب میں گذاری ہوگی۔ تم چاہو تو ایک ایک لمحے کا بدلہ لے سکتی ہو۔ راہ کی صعوبتیں سہنے کے بعد منزل مل جائے تو کیا مسافر اسے کھو دے گا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو کیا معاف نہیں کیا جا سکتا ـــــ ویسے مجرم تمہارے سامنے ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"بدھو ـــــ" عنبرینہ نے اس کا سر سہلا کر پیار سے کہا۔

پھر کارواں وقت آگے بڑھ گیا۔ شاعر کی زندگی سراپا انتظار بن گئی

انتظار ـــــ انتظار ـــــ انتظار۔ کتنی تڑپ اور کتنی کسک ہوتی ہے اس لفظ میں آدمی کبھی مرتا ہے کبھی جیتا ہے۔ کبھی اس کا وجود کھو جاتا ہے۔ کبھی

اس کی پلکیں گیلی ہو جاتی ہیں۔ کبھی اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے ہیں کبھی دل میں ہوک اُٹھتی ہے کبھی لب تھرتھراتے ہیں اور کبھی سانس میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سراپا تصویر درد بن جاتا ہے۔

شاعر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دو چار تھا۔ عنبرینہ کئی دن سے اس سے ملنے نہیں آئی، اور پھر اچانک ایک اداس شام کو وہ چلی آئی۔

"کس جرم کی سزا دے رہی ہو، کس بات کا انتقام لے رہی ہو، کیوں خوشبو بکھیر کر چلی گئی ہو، کیوں آس کا دیا جلا کر چھوڑ گئی۔ کیوں نیّا کو منجدھار میں ڈال دیا، کیوں میری روح کو گھائل کر دیا۔ تمہارے بغیر میں لاشۂ بے کفن بن گیا عنبر ——— خدارا سنبھالو مجھے۔" وہ بہت دُکھی تھا۔

"میں مجبور تھی ———" صرف ایک ہی جملہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"انتظار کے اتنے کاری زخموں کا مرہم یہ جواب نہیں ہو سکتا جانتی ہو میری آنکھیں پتھرا گئیں، تمہاری راہ تکتے تکتے ———" شاعر کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔

"سنو! ہو سکے تو .... مجھے بھول جاؤ ——— یہ سمجھو کہ میں ایک رہگذر ہوں تمہاری منزل نہیں۔ تم راہی تھے پیار کے راستے کے ——— پل بھر کے لئے اس راہ سے گذرے اور آگے بڑھ گئے۔ بھلا دو ان لمحوں کو جو میرے ساتھ گذرے۔" عنبرینہ کے سینے میں ہلچل تھی۔

"نہیں ———" شاعر کا دل تڑپ اٹھا۔ "نہیں خدارا۔ ایسا پھر نہ کہو۔ کبھی نہ کہو۔"

"مگر میں زیادہ دیر تک تمہیں گھنی چھاؤں نہیں دے سکتی

حقیقت کی تپتی دھوپ سے بھی گذرنا ہے تمہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آغاز کہاں سے کروں ؛" عنبر ینہ کے لب لرز گئے۔

"مجھے کسی آغاز و انجام کا پتہ نہیں وہ لمحہ جب تم سے نظر ملی اور دل تمہارے قدموں میں سر بہ سجود ہو گیا وہی میری ابتدا اور وہی انتہا ہے" شاعر کہیں اور گم تھا۔

"نہیں نہیں نہیں ———— وہ چلا اٹھی۔" تم نے غلط سمجھ لیا۔ ہمدردی اور خلوص کو محبت کا نام دیدیا۔ میری مہربانیوں اور نوازشوں کا غلط مطلب لے لیا۔ میں تمہاری ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ میں صوفی سے وابستہ ہوں۔ صوفی ———— ہاں صوفی میری روح میرا ایمان میرا منگیتر ————" لاوا اُبل اُبل کر گرتا رہا اور شاعر جھلسنے لگا۔ شاعر نے محسوس کیا، آسمان شق ہوا بجلی تڑپی اور آشیانہ جل گیا۔

"سوچو ———— میں تم سے کیسے وابستہ ہو سکتی تھی۔ تمہارا اور میرا ملاپ ناممکن تھا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ تم میرے لئے گھنی چھاؤں ضرور بن گئے جہاں میں صوفی کے انتظار کی جھلسا دینے والی دھوپ سے تنگ آکر ستانے بیٹھ گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ تمہیں میری منزل ہو۔ میری کشتی کا ناخدا مجھے صبر کے منجدھار میں چھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا۔ میں جی رہی تھی آس میں، امید پر، تنہائی کے اس صحرا میں مجھے دور ایک بہتا دریا نظر آیا۔ اندھیری رات میں ایک ننھا سا دیا جل رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی کیونکہ مجھے اجالوں کی چاہ تھی، سکون کے چند لمحے چاہیئے تھے۔ انتظار کی صلیب پر اور زیادہ دیر تک کھڑے رہنے کی قائل نہیں رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر دیئے کی لو کو پکڑنا چاہا کہ دفعتاً طلوع سحر ہوئی، آفتاب کی

پہلی کرن نکل آئی اور میں واپس لوٹ گئی، کیونکہ میرا صوفی لوٹ آیا تھا"
عنبر ینہ نے داستان زندگی مکمل کر دی۔

"اوہ ——— تو یہ کہو کہ تم میرے دل کو چند حسین داغ اور میرے تخیل کو چند خوبصورت زخم دے کر اپنا وقت بہلاتی رہیں اور میں انہیں وفا کے موتی سمجھ کر چنتا رہا۔"

"تم سے ملنا، تم سے باتیں کرنا، تمہارے ساتھ وقت گذارنا میرے لئے تسکین جان تھا مگر مقصود زندگی نہیں۔ التفات، خلوص اور نوازشوں کو محبت کا نام نہ دو۔ وفا اور جفا کا ذکر ان قصوں میں نہیں ———"
عنبر ینہ کے الفاظ بارود کے دھماکے بن گئے۔

"تمہارا یہ کھیل دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دلگداز بھی رہا عنبر ینہ ——— تم نے ٹھیک ہی کہا۔ نوازشیں اور مہربانیاں اتنا حق کہاں دیتی ہیں کہ وفاؤں کا حساب مانگا جائے۔ تمہارے انتظار کے لمحے میرے ساتھ فرصت میں کٹ گئے۔ چلو اچھا ہوا، انتظار کی آگ برف تو بن سکی تنہائی کے صحرا میں کہیں سائبان تو ملا تمہیں، اندھیری شب میں کوئی ننھا سا دیا تو کہیں روشن ہوا۔ اب چاہے یہ سائبان رہے نہ رہے، یہ دیا جلے نہ جلے ———"

میں . . . . میں شاید تم سے جیت نہ سکوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا ———" عنبر ینہ اتنا کہہ کر باد صبا کے جھونکے کی طرح چلی گئی۔ مگر شاعر خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز گیا۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور پھر اس روز رک گیا جب صوفی کی کار سے کوئی ٹکرا گیا۔ خون سے تر بتر لاش پر سے جب چادر ہٹائی گئی تو

عبدیہ کی خاموش چیخ فضا میں گونج اٹھی۔

"نہیں شاعر ——— نہیں تم نہیں مر سکتے۔"

"بے شک میں نہیں مر سکتا، میں نے کہا تھا کہ تم کو نہ پا سکا تو خاک پا کو اپنا لوں گا۔ اسی خاک میں مل جاؤں گا جس سے تم بنی ہو ——— پھر میں کیسے مٹ سکتا ہوں۔" شاعر کے جملے فضا میں باز گشت کرنے لگے۔

آج سات سال بعد جب وہ واپس وطن لوٹی تو سب سے پہلے وہ شاعر کی مزار پر پہونچی۔ ہر طرف ویرانی اداسی اور سناٹا تھا، خاک ہی خاک بکھری پڑی تھی۔ جانے کیوں وہ اسے بے حد یاد آگیا ——— وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس کی یاد نے دل میں ہلچل مچادی۔ وہ بھول چکی تھی کہ کوئی اس کی زندگی میں قوس و قزح کے رنگ بکھر کر چلا گیا تھا۔ اس کی تنہائی کے آتش کدے کی سلگتی ہوئی لکڑیوں پر اپنے بے پناہ محبت کے پانی کا چھڑکاؤ کر چکا تھا۔ اپنے چار بچوں اور اپنی گرہستی صوفی کی قربت میں وہ ان لمحوں کو بھول چکی تھی۔ نہ غم جاناں رہا نہ غم دوراں ——— مگر آج وطن کی زمین پر قدم رکھتے ہی خلا میں باز گشت ہونے لگا۔ ہوا کے جھونکے پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔" اسی خاک میں بکھر جاؤں گا جس کی تم بنی ہو۔

——— اور وہ رک نہ سکی۔ کچھ اور نہ سہی وہ اس کا غم خوار، چارہ گر اور دوست تو تھا۔ اس کے قدم قبرستان کی طرف اٹھ گئے، شاعر کی قبر پر پھول ہی پھول کھل اٹھے۔ محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک ایک آنسو کچی کلی بن کر اس کی قبر پر برس رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے قبر کی خاک ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ دفعتاً کسی پرندے کی چہچہاہٹ نے اسے چونکا دیا وہ خاک ہتھیلی سے جھٹک کر اٹھ گئی آنچل سے آنسو خشک کئے اور باہر

— نکل گیا۔

"مما — یہ کس کی قبر تھی —؟"

"تم کیوں اداس ہوگئیں"

"کون لگتے ہیں یہ ہمارے —؟"

بچوں نے سوالات کی بوچھار کردی، کیا جواب دیتی وہ ان کو۔ کس رشتے کا نام دیتی، کیسے سمجھاتی کہ احساس کے رشتوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ بس ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی۔

"شش — مما سے کوئی سوال مت کرو۔ لگتا ہے مما اس سے بہت پیار کرتی ہیں —" ننھا پپو اپنے بھائی بہنوں سے کہہ رہا تھا۔ شمو نے مما کا موڈ ٹھیک کرنے ریڈیو کا سوئچ کھول دیا۔ دھیمے سروں میں کوئی غالب کی غزل گا رہا تھا ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہے تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

عنبرینہ نے اپنا سر سیٹ سے ٹیک دیا اور آنکھیں موندلیں آبشار بہہ نکلا، کار آگے بڑھ گئی۔

پھول انتظار کے

میں ابھی ابھی قبرستان سے لوٹا ہوں، میرے پیر وزنی ہوگئے ہیں۔ سر درد سے جکڑا ہوا ہے۔ میری آنکھیں خشک آنسوؤں کی وجہ سے جلنے لگی ہیں۔ حلق سوکھ رہا تھا۔ پسینے کی وجہ سے میری شرٹ مجھ سے لپٹ گئی ہے۔ میں سیدھے نل کے پاس پہونچا۔ منھ ہاتھ دھوکر اپنے کمرے میں گیا۔ اور بستر پر دراز ہوگیا۔ آنکھیں بند کرلیں یوں لگا جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔

"فرحان بیٹے ...... میں نے آج تمہارے لئے شامی کباب بنائے ہیں۔ رات کو میرے ساتھ ہی کھانا کھالینا۔"

یہ شاہی آنٹی ہی کی آواز تھی یقیناً یہ وہی تھیں۔ نام تو ان کا شہابی بیگم تھا مگر بچپن میں ماں باپ نے پیار سے اسے بگاڑ کر شاہی کر دیا اور بس تب سے وہ شاہی ہوگئی۔ کل کی شاہی باجی آج ہم سب کی شاہی آنٹی بن گئیں۔ عمر چاچا کی سگی بہن اور سارے محلے کی شاہی آنٹی۔

رنگت شہابی جو ان کے نام کے ساتھ مطابقت رکھتی تھی۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، اونچی ناک اس میں جگمگاتی ہیرے کی کیل، چھوٹا سا دہانہ پان کی سرخی لئے پتلے پتلے ہونٹ، گوری گوری کلائیاں جن میں ہر وقت لاڑ بازار کی نت نئے چوڑیوں کے جوڑے سجے رہتے، مخروطی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھی

کے ساتھ عقیق کی انگوٹھی بھی ہوتی۔ پیر میں چاندی کی بہت ہی نازک پازیب جن میں چھوٹے چھوٹے گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ جب وہ چلتیں تو دھیرے دھیرے بجنے لگتے اور ماحول ترنگوں میں ڈوب جاتا۔ گلے میں سونے کا رانی ہار اور اس کے ساتھ روایتی کالی پوت کا لچھا۔ پرنٹڈ ساڑی میں میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہر رنگ کی پلین ساڑی ان کے پاس موجود تھی، جس پر بڑے ہی مناسب انداز کا بارڈر ٹنکا ہوتا اسی رنگ کا پوری آستین والا بند گلے کا بلاوز۔ کیا مجال کہ کبھی پلو سر سے ڈھلکے یا ان کا شہابی رنگ کمر یا پیٹھ کے کسی حصے سے چھلک جائے عمر چاچا کے بڑے دالان میں بیچوں بیچ ایک تخت بچھا رہتا۔ جس پر وہ براجمان ہوتیں۔ سفید چاندنی پر ریشمی قالین بچھی ہوتی۔ گاؤ تکیوں پر گلابی مخمل کے غلاف تخت کے ایک کونے میں پاندان، خاصدان رکھا ہوتا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت صراحی جس پر کروشیا کا گلابی غلاف چڑھا رہتا۔ تخت کے بازو چھوٹے سے اسٹول پر رکھی ہوتی اور اس پر آیۃ الکرسی لکھا ہوا کٹورہ ڈھانکا ہوا رہتا۔

اولاد تو ان کو تھی نہیں محلے کے سارے بچے انہی سے لگے رہتے عمر چاچا کا گھر اچھا خاصا اسکول تھا جس میں چار سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ برس کی عمر تک کے بچے اور بچیاں شامل رہتے۔ وہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح جگمگاتی رہتیں۔ کبھی کسی کے گھر پکوان کرنے چلی گئی ہیں۔ تو کبھی کسی کے بیاہ کی تیاری میں لگی ہوئیں ہیں۔ کسی کے گھر کوئی بیمار ہو تو وہ تیمارداری کے فرائض سنبھال لیں گی۔ کوئی معاشی پریشانی کا شکار ہو تو وہی اس کی حاجت پوری کر دیں گی ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نام شاہی آنٹی ــــــ شاہی آنٹی۔ گویا وہ ہر درد کی دوا اور ہر تالے کی چابی بن گئیں۔

میں بھی ان کے بہت قریب تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے

جب میں ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر ہسپتال میں بھرتی کروا دیا گیا وہی میرے ساتھ رہیں۔ ساری ساری رات جاگ کر انھوں نے میری خدمت کی۔ امی نے بار ہا گھر واپس جانے کو کہا، مگر وہ نہ مانیں۔ ممتا کے سارے چشمے ابل پڑے۔ کون کہتا ہے کہ کوکھ سے جنم دینے والی ہی ممتا دے سکتی ہے۔ عورت کا دل تو ایک عمیق سمندر ہے جس میں ماں کی ممتا، بہن کا پیار، بیٹی کی چاہ، بیوی کی محبت، محبوبہ کی وفا موجوں کی طرح ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ میں شاہی آنٹی کی اس خدمت کو بھول نہ سکا میرے معصوم ذہن اور دل پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ میرے لئے زمانے بھر کی محبت ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ میرے شعور پر پوری طرح حاوی تھیں۔ ایک دن بھی ان کے بغیر سانس لینا دشوار تھا۔

چاندنی راتوں میں ہم اکثر انہیں گھیر کر بیٹھ جاتے۔ وہ ہمیں کہانیاں سنانے لگتیں۔ ــــــ کہانیاں کیا تھیں حقیقتیں، ہی حقیقت تھی ان میں۔ ماضی کے اوراق وہ الٹتیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات پارٹیشن اور ہنگاموں کے قصے کچھ اس انداز سے سناتیں، لگتا کہ بس اب ہونے ہی والے ہیں۔ مگر جانے کیوں وہ اچانک چپ ہو جاتیں، پتھر کی مورت بن جاتیں ان کی آنکھوں کے گوشے ستاروں سے جھلمل کرتے دکھائی دیتے، تبھی عمر چاچا ہم سب کو گھر بھیج دیتے اور انہیں سینے سے لگا لیتے۔ نمکین پانی کا آبشار ان کی آنکھوں سے بہہ نکلتا اور سسکیاں فضا میں پھیل جاتیں۔ میں شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا اور یہ تجسس مجھ میں جاگنے لگا کہ آخر شاہی آنٹی کی زندگی کس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

دیکھنے میں وہ چاق و چوبند تھیں مگر کبھی ایسی باتیں کرنے لگتیں گویا پاگل ہو گئی ہوں۔ ہر صبح فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کر کے خود کو سنوارتی

ان کی عطر کی خوشبو آہنی گیٹ سے ہی آنے لگتی۔ گاؤ تکئے کے بازو چاندی کی تھالی میں جوہی کے تازہ کھلے اجلے اجلے پھول ہمیشہ ان کے قریب رہتے۔ سارا دن وہ بچوں کے ساتھ مصروف رہتیں مگر شام آتی تو ان کا رویہ یکسر بدل جاتا۔

"چلو بچو۔ اب گھر جاؤ مجھے بھی بہت سے کام کرنے ہیں اب وہ آتے ہی ہوں گے۔ پکوان تو کرنا ہے مجھے کچھ چائے کے ساتھ تیار بھی کر لوں تھکے ماندے آئیں گے نا!" اتنا کہہ کر وہ چولھے کے پاس چلی جاتیں۔ ہم تمام بچے ایک دوسرے کا منھ تکتے رہ جاتے تبھی عمر چاچا ہمیں یوں سمجھاتے۔

"بچو۔ جاؤ۔ وہ اب تم سے کل ہی ملے گی، اس وقت تو وہ اپنی دنیا میں مگن ہے۔" اور جانے کیوں عمر چاچا کی آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے۔

سرما کی ٹھنڈک ہو یا گرما کی تپش، ان کے معمول میں فرق نہ آتا وہ ہمیشہ چولھے کے پاس نظر آتیں کبھی پکوڑے بن رہے ہیں تو کبھی سموسے، کبھی بادام کی کھیر تو کبھی حلوہ۔ کبھی مرغ تو کبھی پلاؤ ــــــــ بڑے ہی سلیقے سے سرخ دسترخوان اپنے فرش پر بچھاتیں اور اس پر کانچ کی دو پلیٹیں دو گلاس رکھتیں کانچ کی صراحی ٹھنڈے پانی سے لبریز رہتی۔ دسترخوان پر لوازمات رکھ کر کچھ دیر پنکھا جھیلتیں جیسے کسی کو کھلا رہی ہوں ایک لقمہ بھی خود کے پیٹ میں نہ جاتا پھر آپ ہی آپ کہتیں۔

"اتنا سارا اہتمام کیا ــــــــ مگر کچھ نہیں کھایا۔ ٹھیک ہے کل کچھ اور بنا دوں گی۔" اور پھر برتن سمیٹ کر اٹھالیتیں۔ برتنوں کو رکھ دینے کے بعد وضو کرتیں، اور عشا کی نماز کے لئے بیٹھ جاتیں۔ نماز سے فراغت پاتے ہی دالان کے باہر آتیں۔ آنگن میں مختلف قسم کے پھولوں کے درخت تھے۔ گلاب

موتیا، جوہی، چنبیلی، موگرا۔ مدن مست، رات کی رانی اور جانے کیا کیا۔ ان پھولوں کے پودوں کے درمیان وہ گھومتیں۔ اپنے آپ سے باتیں کرتیں، کبھی ہنس لیتیں، اور کبھی روٹھ جاتیں ——— کبھی شرما کر سرخ ہوجاتیں۔ مسافر شب جب اپنی منزلیں طے کرتا کرتا آگے بڑھتا تب وہ اپنے دروازے کی دہلیز پر آکر بیٹھ جاتیں اور چاند کو تکنے لگتیں۔

شاہی اندر جاؤ۔ کوئی نہیں آئے گا ——— تمہارا انتظار فضول ہے۔ عمر چاچا کی آواز پر وہ بپھر جاتیں۔

"کیوں کہتے ہیں آپ ایسا ——— وہ آئیں گے ضرور آئیں گے۔ میرا انتظار فضول نہیں۔ میں نے آپ سے تو نہیں کہا نا کہ میرے ساتھ بیٹھے رہیں خدارا جایئے آرام کیجئے۔ میں ان کے قدموں کی آہٹ پہچانتی ہوں دیکھئے دیکھئے وہ آرہے ہیں . . . . . وہ آرہے ہیں . . . . . . " اور پھر صبح تک اسی دہلیز پر دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھی رہتیں اذان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوتیں اور پھر روزمرہ کا معمول شروع ہوجاتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ شاید رمضان کا آخری دہا تھا۔ شبِ قدر کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ سارے گھر کی صفائی چل رہی تھی۔ دیواروں پر روغن چڑھایا جارہا تھا۔ دالان کے خوبصورت کھمبوں کے بیل بوٹے از سرِ نو رنگین بنائے جارہے تھے۔ سرخ سرخ پھول سبز سبز پتے بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ شاہی آنٹی کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ سارا دن مزدوروں کے ساتھ لگی رہتیں۔ خود اپنے کمرے کو بڑی سلیقگی سے آراستہ کر رکھا تھا انہوں نے بستر پر گلابی مخملیں چادر بچھی تھی گلابی مچھر دانی کمرے کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ دروازوں پر جالی کے خوبصورت پردے بھی لگ چکے تھے۔ سنگار میز

کے دونوں جانب خوبصورت گلدستے سجے تھے۔ کمرے کو عود و عنبر کے دھوئیں سے معطر کر دیا گیا تھا۔ پورے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر خس کی ٹٹیاں لگا دی گئی تھی۔ جن کی معطر ٹھنڈک دل و دماغ کو تازگی بخش رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مہمان آنے والا ہو۔ محلے کی ساری لڑکیاں ان کے آگے پیچھے گھوم رہی تھیں کیونکہ سبھی کو انہی سے مہندی جو لگوانی تھی۔ وہ افطار کے انتظام کے لئے پریشان تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے کئی چیزیں انھوں نے تیار کرلی تھیں۔ پچھلے کئی برسوں سے عمر چاچا کے یہاں شب قدر کو افطار کا انتظام رہتا تھا۔ محلے کے سارے لوگ شریک رہتے۔ تراویح کی نماز ادا کی جاتی اور پھر سحری کے بعد نعت و سلام پڑھ کر سب رخصت ہوتے۔
شاہی آنٹی کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ جب وحمد و نعت اور سلام پڑھتی تو لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ دل دھڑکنے لگتے اور عقیدت و احترام سے سبھی کی نظریں جھک جاتیں۔

چنانچہ آج بھی شب قدر کا اہتمام جاری تھا۔ افطار کا وقت قریب آرہا تھا۔ آج جانے کیوں شاہی آنٹی بڑی تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی گلابی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں موتی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ابھی افطار کے لئے شاید کچھ لمحے باقی تھے۔ سارے لوگ دالان میں جمع ہو چکے۔ شاہی آنٹی باورچی خانے سے نکل کر سیدھے اپنے کمرے میں گئیں منھ دھو کر وضو کیا، اور وہ گلابی ساڑی نکالی جس پر سنہری موتیوں کا باڈر ٹنکا تھا۔ قد آدم آئینے کے روبرو انہوں نے اپنے آپ کو جی بھر کے دیکھا۔ گلابی چوڑیوں کا جوڑا ان کی گوری کلائیوں پر بڑا کھپ کر بیٹھا تھا۔ بند گلے اور پورے آستین والے بلوز میں رانی ہار اور کالی پوت اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔ انہوں نے آنچل اٹھا کر اپنے

سر پر ڈالا۔ مانگ کی سیدھی جانب چاندی کی ایک خوبصورت سی لٹ بل کر
نکل آئی تھی۔ کنگھا ہاتھ میں لے کر انہوں نے اسے برابر جما لیا اور غور سے دیکھا
تو ایسی چاندی کئی جگہ نکل آئی تھی پچھلے دنوں تو وہ خود کو دیکھتی رہیں پھر آپ ہی آپ
شرما کر کہنے لگیں۔

"اتنے دن بعد مجھے دیکھیں گے تو ضرور کہیں گے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہو
نہیں میں بڑھیا کے روپ میں ان کے سامنے کبھی نہیں آؤں گی۔" اور پھر اتنا کہہ کر
انہوں نے پلو سے اپنے سر کو اچھا ڈھانک لیا اور باہر نکل آئیں۔ تبھی کسی کی باتوں
کی آواز نے ان کے قدم روک لئے۔

"آخر کب تک یہ خود کو دھوکہ دیتی رہیں گی ——" یہ پڑوس
کی خالہ کی آواز تھی۔

کیا کریں —— زندگی ہی گذر گئی۔ چاچی کہہ رہی تھیں۔ ——
ہاں —— وہ تو ٹھیک ہے مگر۔ یوں کب تک چلے گا، کل کو
تمہاری لڑکیاں بھی تو اٹھنے والی ہیں۔
شاہی بیگم کی یہ حالت لڑکے والے دیکھ کر جانے کیا کیا سوچیں گے
کہیں ایسا نہ ہو بننے والی بات ان کی وجہ سے بگڑ جائے ——"
"یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا شاہی تو ایک معصوم سی گڑیا ہے۔
زمانے کے یہ ہیر پھیر وہ کیا جانے۔"
"لیکن دولہن۔ تم تو سمجھدار ہو۔ اُسے بتا سکتی ہو نا کہ ——
وہ ایک بیوہ ہے۔ ایسا سنگار اسے زیب نہیں دیتا۔ وہ کب تک خود کو
سہاگن سمجھ کر فریب کھاتی رہے گی۔ اب تو خیر سے عمر بھی ڈھل گئی۔ ہوش سے
کام تو لینا چاہیئے۔ لڑکیوں کے ساتھ مل کر یہ رنگین دنیا سجاتے پھرنا بھلا کیسے

پسند آئے گا۔ کیوں نہیں بتا دیتے آپ لوگ کہ آفاق میاں زندہ ہی نہیں۔ اگر ہوتے تو کیا ان چالیس برسوں میں کوئی خبر نہ لیتے۔ خالہ بی کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"کون کہتا ہے کہ وہ زندہ نہیں ——— ؟ مجھے بیوہ کہتی ہیں آپ ——— میرا ——— میرا شوہر سلامت ہے۔ کون کہتا کہ میں بیوہ ہوں اتنا منحوس لفظ مجھ سے نہ جوڑیئے۔ ایک سہاگن کے دل کی پکار کو آپ ——— آپ کیا جانیں۔ اپنے سہاگ کی چوڑیاں تو آپ نے اپنے ہاتھ سے توڑی ہیں نا خالا جی! سفید کفن میں اپنے شوہر کو لپٹے دیکھا ہے نا ——— !

مگر میں میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا ——— میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ چلے گئے۔ لیکن کہاں ——— یہ نہیں جانتی ہیں۔ مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ انہوں نے چھ ماہ کی نئی نویلی دولہن کو چھوڑ دیا اور جانے کہاں گم ہو گئے۔ میری کلائیوں کی ان چوڑیوں میں ان کی سانسیں پنہاں ہیں۔ میرے گھار میں ان کا وجود بسا ہوا ہے۔ میں سہاگن ہوں۔ ایک جیتی جاگتی سہاگن۔ میرا یقین مجھے فریب نہیں دے سکتا۔ میرا اعتماد مجھے ٹھیس نہیں پہونچا سکتا۔ میرے انتظار کے پھول کبھی مرجھا نہیں سکتے۔ ان کی خوشبو کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ آپ لوگ سب جھوٹے ہیں۔ سب جھوٹے ہیں۔ ان کی برائی کرتے ہیں۔ وہ یقیناً زندہ ہیں میرے لئے ...... صرف میرے لئے..."

اتنا کہتی ہوئی وہ چکرا کر گر پڑیں۔

ماحول اداس اور سوگوار ہو گیا۔ شاہی آنٹی کو دل کا شدید دورہ پڑ گیا۔ ان کی شگفتگی اور تازگی ختم ہو گئی آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو گئے۔ رنگت

سفید پڑ گئی ان کا جسم نحیف و کمزور ہوگیا۔ ان کی سانسیں دعاؤں کی محتاج ہوگئیں۔ ان کی روح جسم کے قفس سے نکلنے پر تو لنے لگی۔

عمر چاچا اور ان کی بیوی بچوں نے رات دن ان کی خدمت میں لگا دیئے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ یہ دورہ انتہائی شدید ہے اور صرف خدا ہی انہیں بچا سکتا ہے۔ شاہی آنٹی بیمار کیا ہوئیں یوں لگا جیسے سارا محلہ خالی ہوگیا ہو۔ سارے بچے بوڑھے اور جوان عمر چاچا کے ہی گھر میں جمع تھے، بس سارا دن قرآن خوانی ہوتی رہتی۔ سحر و افطار کو شاہی آنٹی کے لئے دعائیں مانگی جاتیں۔ میں بھی ان کی پلنگ کی پٹی سے لگ گیا تھا۔

ان کے معصوم چہرے پر کمزوری کے ساتھ ساتھ ضعیفی کے آثار بھی جھلکنے لگے تھے۔ ان کی تیز سانسوں میں مجھے کسی کی آمد کا احساس ہوتا تھا ان کی کھلی ہوئی آنکھوں میں انتظار تھا۔ اور ان کی نظریں دروازے کی طرف ہی جمی رہتیں۔ میں اندر ہی اندر ان کی حالت پر رو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مالی اپنے چمن کی کلیوں کو بے سہارا چھوڑ کر چلا جا رہا ہو۔ میرا دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

تین دن اور تین رات اسی کشمکش میں گذرے عید کا چاند نظر آیا۔ مبارک سلامت کا شور گونج اٹھا۔ مگر عمر چاچا کے گھر میں سوائے چیختی ہوئی خاموشی کے اور کچھ نہ تھا۔ اسی رات شاہی آنٹی نے مجھے بلایا۔ میں ان کے قریب پہونچا۔

فرحان ـــــ آج کوئی بھی مجھ سے مہندی لگوانے نہیں آیا۔ جاؤ اپنی بہنوں کو اور ساری لڑکیوں کو بلا لاؤ۔ عید کا چاند نظر آگیا نا ـــــ ہر سال تو مہندی کے گل بوٹے ان کی ہتھیلیوں پر میں نے ہی سجائے ہیں نا ـــــ پھر

آج ..... آج کیوں چپ ہیں سب ——— " وہ اپنی تیز چلتی ہوئی سانسوں پر قابو پاکر کہہ رہی تھیں۔ میں دوڑا دوڑا گھر پہونچا اور سب لڑکیوں کو یہ خبر دیدی۔ سبھی دیوانہ وار شاہی آنٹی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ مگر دروازے کے پاس جاکر رک گئے۔ کیونکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور عمر چاچا اور شاہی آنٹی کی باتوں کی آ رہی تھی۔ میں ان کے سرہانے والی کھڑکی کی طرف دوڑ کر پہونچ گیا اور دھیرے سے پیٹ سرکا کر باتیں سننے لگا۔

" بھائی جان ——— ساری زندگی تو آپ نے میرے انتظار کی اس دیوانگی کی لاج رکھ لی۔ خدارا ——— اب بھی میری آس اور امید کی اس ہچکولے کھاتی ناؤ کو اپنے یقین کے پتوار سے کنارے تک پہونچا دو۔"

" شاہی ——— میری بہن۔ تو نے زندگی کے اس بھیانک مذاق کو بڑی ہمت سے جھیل لیا۔ پندرہ سال کی عمر سے پچپن برس کی عمر تک کا فاصلہ ست رنگی رنگوں میں رنگ کر طے کر لیا۔ میں جانتا ہوں تیرا انتظار تیری عبادت کا ایک حصہ ہے۔ آفاق کو گئے آج چالیس برس گذر گئے مگر تو نے اس کے نام کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ میں نے کتنا سمجھایا تھا تجھے۔ پہاڑ جیسی عمر اتنی آسانی سے نہیں کٹ سکتی، مگر تو نے تو انتظار کا سہارا لے کر قسم کھالی تھی تا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک آفاق کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ کتنی کوشش کی ہیں نے پتہ نہیں وہ ہے بھی کہ ——— "

" نہیں بھائی جان ——— اس کے آگے ایک لفظ نہ کہو میں سہاگن ہوں ——— میں سہاگن ہوں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ——— میرے انتظار کے پھولوں کو میرے بعد بھی سجائے رکھنا۔"

" بولو شہابی۔ بولو ——— " عمر چاچا نے شاہی آنٹی کے

ہاتھ تھام لئے۔

"میں جب مرجاؤں تو میرے جنازے پر سفید چادر نہیں بلکہ سرخ چادر ڈال دینا تاکہ دیکھنے والے یہ کہیں کہ ...... دیکھو ایک سہاگن جا رہی ہے ورنہ میں ...... میں حشر کے دن ...... آپ کی ...... دامن گیر رہوں گی۔" لفظوں کی بندش ٹوٹ گئی

عید کی صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی کلمہ شہادت پڑھتی ہوئی شاہی آنٹی نے آنکھیں بند کرلیں ____ میں نے دیکھا جنازے پر سرخ چادر ڈالی گئی تھی یقیناً وہ سہاگن تھیں۔ میں ابھی ابھی قبرستان سے لوٹا ہوں۔ میرا دل بہت اداس اور مغموم ہے۔ ہزاروں لوگوں نے عید کی نماز کے ساتھ ایک سہاگن کی نماز جنازہ بھی ادا کی تھی۔

آج شاہی آنٹی کی فاتحہ سوم ہے۔ گلاب کے چند تازہ پھول لئے میں قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ قبر کو لوگ گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے مشکل سے اپنے لئے راستہ بنایا اور قریب پہونچا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں میرے سامنے ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک بلند قامت خوبرو شخص تھا جس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو کے قطرے بھرے پڑے تھے جس کے سرخ و سفید رنگت میں غم و اندوہ کے بادلوں کا سایہ پھیل گیا تھا جس کی مونچھوں کی سفیدی میں عجیب بانکپن تھا۔ قبر کے پاس بیٹھا تازہ مٹی کو ہاتھ میں لئے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ عمر چاچا نے اس کے شانو پر ہاتھ رکھا۔

"اٹھو آفاق ____ اس مٹی کے ڈھیر پر اب کیا کروگے۔ تمہارے یہ آنسو اس کے انتظار کا ثمر ہے۔ اس کا انتظار یقیناً سچا تھا۔ اس کی عبادت رب نے قبول کرلی۔"

وہ کسی بچے کی طرح تڑپ رہے تھے۔ سب لوگ انھیں تھامے گھر لئے جا رہے تھے۔ میں نے لوگوں کو بس اتنا کہتے سنا۔
"پولیس ایکشن کے وقت آفاق صاحب پاکستان چلے گئے وہاں ملٹری جوائن (Join) کر لی اور پھر وہاں سے لندن چلے گئے۔ شادی بھی کر لی بچے بھی جوان ہو گئے۔ کہہ رہے تھے پچھلے ایک ہفتہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہندوستان بلا رہا ہے۔ حیدرآباد کی سرزمین آوازیں دے رہی ہے وہ رک نہ سکے اور کسی صورت چلے آئے ——— سچ ہے یقین صادق ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے"

میں نے سب کچھ سن لیا۔ میرے ہاتھ میں رکھے گلاب کے پھول آپ ہی آپ شاہی آنٹی کی قبر پر گرنے لگے میری آنکھیں عقیدت کے آنسو بہانے لگیں...... یقیناً شاہی آنٹی کے انتظار کے پھول فضا میں اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے۔